224066

UNIVERSAL LIBRARY
OU_224066
UNIVERSAL LIBRARY

OUP—67—11-1-68—5,000.

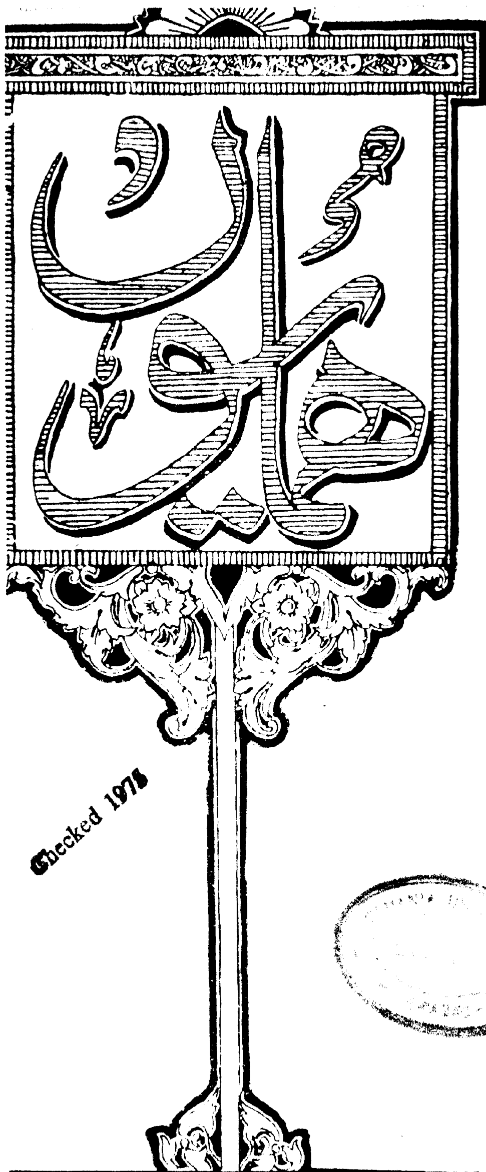
OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ۳۴ ۵ Accession No. U 966.

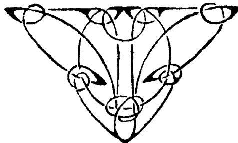
Author

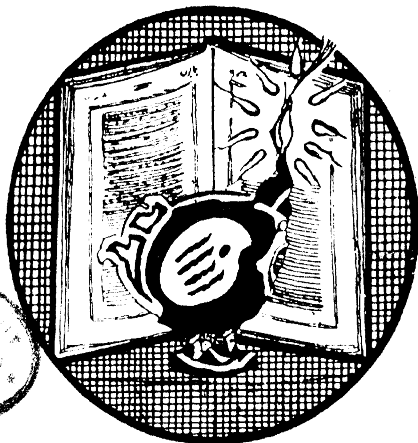
Title

This book should be returned on or before the date last marked below.



رِ علم و فضلِ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم





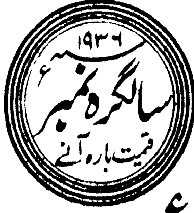
Checked 1978



ایڈیٹر: بشیر احمد. بی. اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا.
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں. بی. اے



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ جنوری ۱۹۳۶ء

تصاویر ـــــ (۱) روح اور بدی (رنگین)، (۲) ہٹلر (۳) مسولینی (۴) حسنِ بلوریں (۵) فطری تناسب (۶) مصنوعی تناسب (۷) جھولا (۸) قہقہہ (۹) بچپن (۱۰) بڑھاپا۔

چندہ سالانہ مع سالگرہ نمبر ۶ؔ — ششماہی ۳ؔ مع محصول — قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ر

کلامِ ہمایوں

میخانہ ایسا چاہیئے ہم مشربو! جہاں
کوئی نہ مست ہو نہ کوئی ہوشیار ہو
پیمانۂ شکستہ کے ٹکڑے ہوں منتشر
ساقی نہ ہو نہ مے نہ کوئی بادہ خوار ہو
پیرِ مغاں کے گرد ہو اِک انجمن لگی
عقلِ جواں بھی جان سے جس پر نثار ہو
روشن ہو نور سینے میں اِک شمع کی طرح
قربان اُس پہ دِل مرا پروانہ وار ہو

حضرتِ ہمایوں (مرحوم)

بزمِ ہمایوں

پانچ چھ ہفتے ہوئے مدیر ہمایوں ۱۹۳۵ء کے بہت سے اُردو رسائل کے پرچے اپنے اردگرد پھیلائے دیکھ رہا تھا کہ اس سال میں اُردو زبان کو کتنی ترقی ہوئی اور کتنا تنزل اور اس ترقی و تنزل میں "ہمایوں" کا کتنا حصّہ ہے؛ گھنٹوں گزر گئے آخر طبیعت اِس دفترِ بےمعنی سے تنگ آگئی اُٹھا نیچے اُترا باہر نکلا اور جلد جلد ٹہلتے ہوئے کتابوں کی ایک دکان میں جا پہنچا۔ تازہ ترین کتابوں کی الماری کے سامنے جا کر کھڑا تھا کہ معاً اس کتاب پر نظر جا پڑی :-

"کاہلی کی تعریف میں" In Praise of Idleness

برٹرنڈ رسل Bertrand Russell

فوراً باچھیں کھل گئیں۔ رسل اُس کے نزدیک دُنیا کے عظیم ترین فلسفی مفکروں میں تھا، رسل نے کاہلی کی تعریف کی ہے! خدا کا شکر ادا کیا کہ قدرت نے ایک ایسے مشہور و معروف فلسفی کے ذریعے سے ہماری زندگی کی داد دی ہے۔ فوراً کتاب خرید لی۔ پہلا مضمون تو وہی تھا "کاہلی کی تعریف میں"، دوسرا بھی ماشاء اللہ تھا "بے سود" علم، سیاسی ہند کی مصروف دُنیا میں اُردو ادیبوں کے علم کو عموماً "بے سود" کہا جاتا ہے، سو اس سے بھی تسلی ہوئی اور دل نے اپنے آپ سے بآوازِ بلند کہہ دیا کہ رسل واقعی دُنیائے حاضر کا سب سے عقلمند آدمی ہے جو طبیعی و تمدنی معلومات کے مقابل میں خالص ادبیات کے "بے سود" نظری و خیالی مضامین کی تعریف کرتا ہے۔

ہم عصر اجازت دیں تو مثال کے طور پر اُن کے بعض مضامین کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے :-

مضامین

"بے سود"	"سُود مند"	
ضرب الامثال اور اُن کے ماخذ	قاضی نذرالاسلام کی تین انقلابی نظمیں	(اُردو)
فلسفۂ جمال	کرۂ زمین	(ہندوستانی)
فلسفۂ ترقی	ہندوستان کا تعلیمی نصب العین	(جامعہ)
مکتوبات	ملاحظات	(نگار)
ہندی فنِ رقص	اُردو ہندی کا قضیہ	(زمانہ)
سسلی میں مسلمانوں کا تمدن	ترکوں کی تعلیمی حالت	(معارف)

دو ٹنگا جانور (ڈراما)

ڈرامے کے ڈھائی ہزار سال

بزمِ تحقیق

مشورہ (اصلاحِ زبانِ اُردو)

اُردو شاعری اور شراب

افسانہ اور حقیقت نگاری

پردہ اور بے پردگی (ساقی)

ہمارا ڈراما کدھر جا رہا ہے (ادبی دُنیا)

اصلاحات، ذاتیات، تعلیمات (شاہکار)

ایشیا کی بیداری اور ہندوستان (نیرنگِ خیال)

تلوار (عالمگیر)

پھوہڑ بیوی کی اکاون لاکھ علامتیں (ہمایوں)

لیکن اپنا اپنا مذاق اپنی اپنی پسند! ہم کاہلوں کو اگر "بے سُودوں" میں سُودمندی نظر آئے اور "سُودمندوں" میں محض بے سُودی تو آپ پڑ چالاکوں" کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ عہدِ حاضر کی ترقی کے نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب کی "سُودمندی" کی جانچ کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں ادھر والے دوسرے میں اُدھر والے مضامین کا انبار لگا کر دیکھ لیں کہ کونسا بھاری ہے؛

بدقسمتی سے مدیرِ ہمایوں بھی باوجود خود رسل کا پیرو اور اُس کے تازہ ترین فلسفے کا عملی معتقد ہونے کے اپنے مضمون نگاروں اور خریداروں کو بجائے سُستی کے چُستی ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؛ کہنا کچھ کرنا کچھ، یہ خود ساختہ ادیبوں کا پُرانا شیوہ ہے۔

ہر چند اکثر اوقات جی چاہتا ہے کہ اس موٹر کار کی دُنیا میں بیل گاڑی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ لہلہاتے کھیتوں کی سیر کریں لیکن مسولینی ہٹلر، کمال، سٹیلن، ہندو سبھا، مسلم لیگ دم بھر کو چین نہیں لینے دیتیں، بلکہ ستم ظریفی یہ کہ اُردو کا خالص "ادبی" رسالہ بھی نذر الاسلامی نظموں سے امن پسندوں کے قلبی اطمینان میں خلل انداز ہو جاتا ہے پھر ہمایوں تو ہمیشہ یہی "سود مند" نعرہ لگاتا ہے کہ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا! زمانے کا ساتھ لازم ہے سو میر و سودا، غزل کے رجحانات، حقیقت نگاری نظموں غزلوں وغیرہ کی لُطف اندوزی کو کم کرو اور مشاہیرِ عالم اور ہندوستان کا جدید دستور، موجودہ تعلیم اور سیاسی ہی اور قلابازیوں کی طرف توجہ کرو کہ اب علم و ادب کو بھی خدا جانے کب تک تمدن و سیاست کا دست نگر ہو کر رہنا پڑے گا۔

اخیر میں ہم اپنے اِن "سُودمند" و "بے سُود" مضمون نگاروں کا دِلی شکریہ ادا کرتے ہیں:۔

(نثر نگار) حضرات: کیفی، فلک پیما، ادیب، سعادت حسن منٹو، فیاض محمود، عطاء اللہ کلیم، مہدی علی خاں، شمسی گاکوی، حمید احمد خاں، مختار عابدی، وقار عظیم، ماہر القادری، فہیم بیگ، تمنائی، صغیر احمد، طاہرہ دیوی عثمانی، فاروقی، ابنِ مریم، حسن عباس، ابوسعید، وقار انبالوی، قریشی، بیگم محمد اسلم نسان، محمد صدیق تائبی، طاہر قریشی، دوست محمد خاں، احمد وجودی، بابر بٹالوی، عبدالقادر جیلانی، باری، پرسرام۔

(شعراء) حضرات: جوش، احسان ماہرہروی، عدم، مقبول، اثر صہبائی، نشتر جالندھری، اکبر منیر، روش صدیقی، راشد وحیدی، صدق جائسی، جلال، ح ب صاحبہ، اختر شیرانی، نجیب، خیال، سروپ رانی نگار، اندر جیت شرما، امر چند قیس، رام پرشاد ناشاد، علی منظور۔

بشیر احمد

جہاں نما

اگر ۱۹۳۵ء پر ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو اُس کا نقشہ واقعات ہمیں یوں نظر آئے گا:-

جنوری فرانس اور اطالیہ کی مفاہمت
سار جرمنی کو واپس مل گیا

اپریل جرمن اسلحہ افزائی کا اعلان
انگلستان فرانس اور اطالیہ سٹریزا کانفرنس میں مشورہ کرتے ہیں۔

مئی فرانس اور رُوس کا عہدنامہ
حبشہ کے خلاف سولینی کی فوجی تیاری

جُون انگلستان اور جرمنی کی بحری مفاہمت

جولائی اطالوی فوجیں حبشہ کو روانہ ہوتی ہیں
اگست انگلستان مجلسِ اقوام کے معاہدے کی حمایت کرتا ہے

اکتوبر اطالیہ حبشہ پر حملہ کرتا ہے
نومبر مجلسِ اقوام اطالیہ کے خلاف معاشی اقدامات نافذ کرتی ہے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اہم ترین واقعات دو ہیں :

۱۔ جرمن اسلحہ افزائی کا اعلان

۲۔ حبشہ پر اطالیہ کا حملہ

سال کے نصفِ اوّل میں ہم جرمنی کا شور و غل سُنتے رہے، سال کے نصفِ آخر میں اطالیہ کا یعنی پہلے ہٹلر! ہٹلر! ہٹلر! ہوتا رہا پھر مسولینی! مسولینی! مسولینی! دوسرے لفظوں میں یُوں کہئے کہ ۱۹۳۵ء پر فقط دو شخص قابض رہے :

ہٹلر اور مسولینی !!

سال کے شروع میں علاقۂ سار کے متعلق مسئلہ درپیش ہُوا۔ ورسائی کے معاہدے کے مطابق سار کے علاقے پر جس میں کوئلے کی بہت سی کانیں تھیں کم از کم پندرہ سال کے لئے فرانسیسی قابض رہے۔ اب وہاں کے باشندوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں فرانس میں شامل ہو جائیں چاہیں جرمنی میں یا دونوں سے الگ رہیں۔ مدت سے ہٹلریوں کی کوشش تھی کہ یہ جرمن لوگ پھر جرمنی میں آکر شامل ہوں۔ اس سلسلے میں دو تین ماہ بہت بے چینی رہی یہاں تک کہ اہلِ سار نے فیصلہ کیا کہ وہ جرمنی کا جزو بنیں گے۔ یہ ہٹلر کی پہلی خارجی فتح تھی۔

اس کے تین ماہ بعد ہٹلر نے جرمنی کی اسلحہ افزائی کا اعلان کر دیا کہ اب جرمنی ایک کمزور ملک بن کر دُنیا میں رہنے پر تیار نہیں، وہ مساوات کا دعوے دار ہے۔ ورسائی کے معاہدے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ تمام قومیں اپنی فوجی قوت کو کم کریں گی۔ جرمنی کے ہتھیار چھین لئے گئے لیکن دوسری قومیں جوں کی توں ہتھیار باندھے رہیں، اس پر کب تک عمل درآمد ہے گا؟ یہ ناممکن ہے کہ جرمنی دوسری آزاد قوموں کے درمیان گویا غلام بن کر زندگی گزارے۔ جرمنی کسی سے کچھ لینا نہیں چاہتا لیکن وہ مساوات اور اطمینانِ قلب ضرور چاہتا ہے اور عہدِ حاضر میں یہ چیزیں اُسی قوم کو میسّر آسکتی ہیں جو دوسروں کے برابر فوجی طاقت رکھتی ہو۔

فرانس اس دلیرانہ اعلان پر بہت بے چین ہُوا۔ وہ مُدت سے جرمنی سے خائف تھا؛ جنگِ عظیم میں جرمنی کو شکست دے کر بھی وہ اُس سے ڈرتا رہا، اسی ڈر کی وجہ تھی کہ اُس نے جرمنی پر ایسی کڑوی صلح کی شرائط کا بار ڈالا مبادا جرمنی پھر جلد اپنا سر اُٹھائے اور اُس پر حملہ کر دے۔ جنوری میں فرانس نے اطالیہ کے ساتھ ایک سمجھوتا کیا۔ چند سال پہلے فرانس اطالیہ کو کبھی خاطر میں نہ

لاتا تھا، اطالیہ ایک معمولی سی طاقت تھی، لیکن اب مسولینی کی برانگیختگی اور ریشہ دوانیوں سے اُدھر اطالوی زیادہ دلیر اور اِدھر یورپ کی مجلس میں اطالیہ کی سیاسی حیثیت زیادہ زبردست ہو چکی تھی۔ اب اُس کا ہمسایہ فرانس بھی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور جب جرمنی حد سے بڑھ کر قدم مارنے لگا اور فرانس کے دل میں خوف پیدا ہوا تو اُس نے اطالیہ سے ہر طرح راہ و رسم بڑھانا شروع کیا۔ مسولینی نے کہا ہاں ہم جرمنی کی گستاخی کا سدِ باب کریں گے لیکن لاؤ ہمیں کیا دیتے ہو؟ جنگ عظیم کے خاتمے پر تم لوگ لوٹ مار کا سب مال سنبھال بیٹھے ہیں کچھ بھی نہ دیا، اب ہماری حبشہ پر نظر ہے کہو کیا کہتے ہو؟ فرانس یہ سن کر پہلے خاموش رہا پھر مسکرا دیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور یوں یہ مفاہمت ہو گئی + اپریل میں جرمن اعلان کے بغیر انگلستان فرانس اور اطالیہ نے سٹریزا کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ مغرب کے متعلق تو جرمنی نے لوکارنو کے عہد نامے میں (۱۹۳۴ء میں) کہہ دیا تھا کہ مجھے نئی سرحد منظور ہے، میں فرانس سے آلساس لورین واپس لینے پر مُصر نہیں لیکن اپنی مشرقی حدود کے متعلق اُس نے سمجھوتا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ دراصل جرمنی یہ چاہتا تھا کہ اب جب کہ فرانس مجھ سے آلساس لورین کے علاقے لے چکا ہے تو اُسے معترض نہ ہونا چاہیے اگر میں وسطی و مشرقی یورپ میں اپنے غصب شدہ علاقوں کو پھر اپنا بنا لوں۔ لیکن فرانس، مغرور فرانس، خائف فرانس ہر طرح ہر طرف جرمنی کی طاقت کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا چنانچہ سٹریزا کانفرنس میں اُس نے دوسری دونوں دول کو اس بات پر متفق کر لیا کہ جس طرح لوکارنو کے عہد نامے سے ورسائی کے عہد نامے والی مغربی حدود محفوظ ہو گئیں اُسی طرح ایک مشرقی عہد نامہ مرتب کیا جائے جس کے ذریعے سے ورسائی والی مشرقی حدود بھی محفوظ کر دی جائیں۔ نیز یہ دیکھ کر کہ نازی جرمنی آسٹریا کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ قرار پایا کہ تینوں دول آسٹریا کی خود مختاری کے قیام و استحکام کی ہر طرح ذمہ دار ہیں + فرانس کی تجویز پر جنیوا میں مجلسِ اقوام نے جرمنی کے اعلان پر احتجاج کیا۔ ہٹلر نے جواب میں جرمنی میں ایک عظیم الشان جلسہ کر کے اس احتجاج کو بے معنی قرار دیا۔ فرانس کا جواب الجواب یہ تھا کہ اُس نے رُوس کے ساتھ باہمی امداد کا ایک معاہدہ کر لیا، وہی رُوس جسے اب تک مکروہ و ملعون سمجھا جاتا تھا اب "سب سے مہذب" قوم کا حلیف بن گیا، سیاست میں شرم کو دخل نہیں وہاں تو وقت وقت کی پہچان ہے کہاں اعلےٰ سیاست کہاں نام نہاد اخلاق؟ اُدھر جرمنی کی چالاکی بھی کسی سے کم نہ تھی اُس نے انگلستان سے ساز باز شروع کیا اور بحری طاقت کے متعلق دونوں پرانے رقیبوں میں ایک مفاہمت ہو گئی۔ فرانس نے اسے ناپسند کیا مگر اپنا اپنا مطلب اپنی اپنی پسند، کوئی کسی کو کیا کہہ سکتا ہے؟ انگلستان کو رُوس سے اجتناب ہے مگر فرانس اُس سے اتحاد کرتا ہے کیونکہ اس سے فرانس کے دل کو ڈھارس بندھتی ہے، فرانس کو جرمنی سے نفرت ہے مگر انگلستان اُس سے مفاہمت کر رہا ہے کیونکہ اس سے انگلستان کی مشکل حل ہوتی ہے یعنی پرانے اتحادی ذرا ایک دوسرے سے دُور دُور ہوتے جاتے ہیں!

اِدھر ابھی یہ چالیں چلی جا رہی ہیں اُدھر مسولینی کی حکمتِ عملی ان اُلجھنوں کا فائدہ اُٹھا کر اپنی گتھی کو سلجھا رہی ہے، فرانس

اور جرمنی کی رقابت اطالیہ کی طاقت میں اضافہ کر رہی ہے۔ فرانس اور اطالیہ دونوں چاہتے ہیں کہ آسٹریا کا وجود معرضِ خطر میں نہ پڑے اس لئے نہیں کہ انہیں اس غریب سے محبت ہے بلکہ اس لئے کہ مبادا آسٹریا کی شمولیت سے جرمنی طاقتور ہو جائے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ یورپ میں آسٹریا کو بچاؤ اور افریقہ میں حبشہ کو ہڑپ کر جاؤ۔ حبشہ کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ یورپی قوموں کی ریشہ دوانیوں کا ایک سبق آموز باب ہے:۔

۱۸۸۹ء۔ حبشہ نے ایک معاہدے کے مطابق اطالیہ کو کچھ مراعات دیں۔ اطالیہ نے دخل در معقولات دینا شروع کیا۔

۱۸۹۳ء۔ اطالیہ کا یہ رویہ دیکھ کر حبشہ نے معاہدے کو منسوخ کر دیا۔

۱۸۹۶ء۔ اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔

۱۹۰۶ء۔ انگلستان، فرانس اور اطالیہ نے معاہدہ کر کے سمجھوتا کیا کہ حبشہ کے متعلق "صورتِ موجودہ" قائم رہے۔ درپردہ یہ حبشہ کی تقسیم کا آغاز تھا۔

۱۹۱۵ء۔ اطالیہ کو جنگِ عظیم میں اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے انگلستان اور فرانس نے حبشہ کے متعلق اطالیہ سے "کچھ وعدے" کئے۔

۱۹۱۹ء۔ اطالیہ نے انگلستان سے کہا میں حبشہ میں تمہارے "حقوق" کے "تحفظ" کے لئے تمہاری مدد کو تیار ہوں۔ انگلستان نے کہا شکریہ۔ تمہاری مدد کی مجھے ضرورت نہیں۔

۱۹۲۳ء۔ حبشہ مجلسِ اقوام کا رکن بنا۔ اس میں اطالیہ نے اُس کی مدد کی اور انگلستان نے مخالفت۔

۱۹۲۵ء۔ اطالیہ اور انگلستان کے درمیان حبشہ کے متعلق سمجھوتا ہو گیا۔ دونوں نے حبشہ کے مختلف حصّوں پر ایک دوسرے کے "حقوق" تسلیم کئے۔ اس کا حبشہ کو علم ہوا تو اُس نے ناخوشی اور اختلاف ظاہر کیا۔

۱۹۲۶ء۔ انگلستان نے حبشہ کو زیلا کی بندرگاہ تحفۃً پیش کی۔ حبشہ نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

۱۹۲۸ء۔ اطالیہ اور حبشہ کے درمیان معاہدہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کی خود مختاری کا لحاظ رکھیں گے۔

(حبشہ یورپینوں کے ذریعے اپنے ملک کو فروغ دیتا ہے لیکن اطالویوں سے رُوگردانی کرتا ہے)

۱۹۳۴ء۔ حبشہ میں انگریزی "اثر" بڑھتا ہے اطالوی "اثر" گھٹتا ہے۔ یہ افواہ پھیلتی ہے کہ انگلستان اور حبشہ کے درمیان کوئی مخفی عہدنامہ ہوا ہے سو اطالیہ فرانس سے گفت و شنید کر کے اپنے "حقوق" کے "تحفظ" کا انتظام کرتا ہے۔

۱۹۳۵ء۔ اطالیہ اپنے حقوق کے "تحفظ" کے لئے پہلے حبشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اور پھر اُس پر حملہ کر دیتا ہے تاکہ یوں اُسے "مہذب بنائے"۔ مجلسِ اقوام حبشہ کی حمایت میں اطالیہ پر "معاشی اقدامات" عائد کرتی ہے۔ انگلستان کمزور قوموں

کی حمایت" کا بیڑا اُٹھاتا ہے۔

جس طرح مغرب میں جرمنی اپنی فوجی قوت کے بڑھانے کے درپے ہے اور اطالیہ اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتا ہے اُسی طرح مشرق میں جاپان اپنی تجارت کو پھیلانے اپنی بحری طاقت کو بڑھانے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا متمنی ہے اور کیوں نہ ہو؛ وہ یورپ کا شاگرد ہے جو اب اپنے اُستاد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ وہ بھی پہلے تجارت سے شروع کرتا ہے پھر کہتا ہے اب میرے حقوق کا تحفظ لازم ہے اِس حقوق کے تحفظ کے لئے برّی اور بحری طاقت کی ضرورت ہے، اُس کی آبادی بڑھ رہی ہے جس کے لئے نوآبادیات کی ضرورت ہے جنوبی امریکہ میں، افغانستان میں، حبشہ میں، بلکہ انگلستان اور شمالی امریکہ تک میں اُس کی مصنوعات سے منڈیاں بھری پڑی ہیں مال سستا بناتا ہے اور سستا ہی بیچتا ہے بڑے بڑے صنعت گر ملک اُس کے مقابل میں مات پڑ رہے ہیں۔ افغانستان میں جاپانیوں نے ملک کی صنعتی ترقی کے لئے اپنی تجویزیں پیش کی ہیں حبشہ میں اُس کے روئی کے کھیت سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سو جس طرح انگلستان کی تجارت اُس کے سیاسی اقتدار کا پیش خیمہ بنی اُسی طرح اب جاپان کی تجارت ہر جگہ اُس کے اثر کا جھنڈا اُڑائے پھرتی ہے۔ یورپ کو خانہ جنگی میں مصروف دیکھ کر جاپان نے اعلان کر دیا کہ خبردار چین کو مت چھوٗو یہ میرا مال ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد جو جاپان کو بحرالکاہل کے وسط میں چند جزائر کی حکم برداری ملی اب وہ اُس کا پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے اور انہیں اپنے بحری زور و قوت کا ایک مرکز بنا رہا ہے۔ اِس سے امریکا ناراض ہے بارہ چودہ سال ہوئے جو واشنگٹن کا بحری معاہدہ انگلستان، امریکہ اور جاپان کے درمیان ہوا تھا جس کی رُو سے بحری طاقت کا تناسب ۵، ۵، ۳ قرار پایا تھا جاپان نے دسمبر ۱۹۳۴ء میں اُس معاہدے سے دست برداری کی اطلاع دے دی تھی اور اب وہ ۴، ۴، ۴ کا تناسب چاہتا ہے یعنی وہ امریکہ اور انگلستان کی برابری کا دعویٰ دار ہے۔ امریکہ اس پر چیں بہ جبیں ہو رہا ہے لیکن انگلستان نے خاموشی سے جاپان کے ساتھ ایک سمجھوتا سا کر لیا ہے۔ جاپان چین میں روز بروز اپنی طاقت اور سلطنت کو بڑھا رہا ہے مانچوریا، مانچوکُو اور منگولیا یہ ہیں جاپان کی منزلیں چین کے اندر، آئے دن جاپان کوئی نہ کوئی حکم چین کے نام صادر کرتا ہے فلاں شہر میں تمہارے آدمیوں نے میری توہین کی فلاں جگہ ایک جاپانی زخمی ہوا، پیکن گویا اُس کے قبضے میں ہے۔

اُدھر سوویٹ رُوس ڈرتا ہے کہ سائبیریا پر اس زرد قوم کی نگاہیں ہیں اِدھر ڈچ لوگ خائف ہیں کہ جاوا سماٹرا اس کی دست بُرد سے بچے رہیں۔ چالاک دُور اندیش انگلستان اشارۃً سمجھاتا ہے کہ زرد میاں! بےشک تمہارے خیالات حق بجانب ہیں تمہاری ضروریات قابلِ فہم ہیں، تم میرے آسٹریلیا اور میرے ہندوستان کو میرا ہی بنا رہنے دو اور باقی شمالی چین میں وسط بحرالکاہل میں اِدھر اُدھر جو چاہو کرو، ہم دونوں تاجر بھائی ہیں!

سوویٹ رُوس وہ ملک، جو چند ہی سال ہوئے دُنیا بھر میں ایک اشتمالی انقلاب برپا کرنا اپنا انسانی فرض سمجھتا تھا تھوڑی

مدت سے خارجی معاملات میں نہایت صلح مندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ اشتمالیوں نے جانچ لیا ہے کہ اگر ہم بیرونی ملکوں میں اپنی انقلابی کارروائیوں پر زور دیں گے تو سرمایہ دار ملک متحد ہو کر ہماری مخالفت کریں گے اور ہماری اپنی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ پہلے بہتر ہے کہ ہم اپنے گھر کی خبر لیں اپنا کیل کانٹا درست کریں جب مضبوط ہو جائیں گے تو پھر کہیں عالمگیر انقلاب کے خواب دیکھنے کی تجویز سوچیں گے۔ سو کچھ مدت سے سوویٹ والے انگلستان اور فرانس اور کئی دوسرے ملکوں سے راہ و رسم بڑھا رہے ہیں۔ کون گمان کر سکتا تھا کہ فرانس سوویٹ کا جانی دشمن اُس سے اتحاد کا خواہش مند ہو جائے گا مگر حق یہ ہے کہ سیاسی دُنیا میں تعجب کسی قسم کی تبدیلی پر بھی نہ کرنا چاہئیے یہاں کل کے جانی دشمن آج ایک دوسرے کے عاشق زار بن جاتے ہیں موقع ضرورت، نفع یہ ہے سیاست کا مذہب اور یہی اُس کا قانون۔ اصول، وفاداری، ایمان، اِن سے کیا مطلب! رُوس اب مجلس اقوام کا ایک سرگرم رُکن ہے وہ جنیوا میں بین الاقوامی مصالحت پر تقریریں کرتا ہے اور اپنے گھر میں بدستور اشتمالی اصولوں کا پیرو ہے۔ روس میں بچوں کی تعلیم کی نئی راہیں کھل رہی ہیں بچے ابھی چھ برس کے نہیں ہو چکتے کہ انہیں بین الاقوامی اور اشتمالی اصُولوں سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ خواندہ لوگوں کی تعداد پانچ سال ہوئے ۷۰ فی صدی تھی اب ۹۰ فی صدی سے بھی زائد ہے۔ صفائی اور حفظ صحت نے شہروں کو آئینہ سا بنا دیا ہے۔ مزدوروں کے لئے نئی وضع کے مکان بن رہے ہیں، عورتوں کے لئے بچوں کی تربیت گاہیں ہیں، بیویوں کے لئے آزادی ہے، صنعت وحرفت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے لیکن سٹیلن ابھی ھَل مِن مزید کا نعرہ لگا رہا ہے۔ جرمنی اور جاپان رُوس کے دشمن ہیں لیکن اور سرمایہ دار ملکوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات بڑھ رہے ہیں اور اس لئے رُوس کی اشتمالیت اب خاموشی کے ساتھ دُنیا پر اپنا اثر پیدا کر رہی ہے +

اس سارے بیان سے واضح ہے کہ اِس وقت دولِ عظمےٰ میں تین طاقتیں جنگی تیاریاں کر رہی ہیں جرمنی اطالیہ اور جاپان! یہ اپنے مقبوضات میں وسعت اور اپنی خوشحالی میں فروغ چاہتی ہیں۔ اس کے برعکس تین طاقتیں ہیں جو صلح کی خواہش مند ہیں، انگلستان فرانس اور روس! یہ اپنے موجودہ مقبوضات کو بحال اور اپنی خوشحالی کو فقط برقرار رکھنے کی آرزومند ہیں۔ امریکہ دُور ہے وہ الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے لیکن اگر عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو ایک ایسی طاقت کا الگ تھلگ بیٹھے رہنا ناممکن ہے "صُلح جُو" طاقتیں "جنگ جُو" طاقتوں کو صلح پسندی کا اصُول سمجھاتی ہیں، جنگ جُو طاقتیں جواب دیتی ہیں کہ ہاں جب ہم بھی دُنیا کے اتنے طویل وعریض حصے پر قابض ہو جائیں گے تو ہم بھی صُلح پر لکچر دینے لگیں گے "موجودہ حالت" پر اطمینان صرف انہیں کے شایانِ شان ہے جو مدتوں سے اشیاء و اراضی پر اپنے حصے سے بڑھ کر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ اور یوں یہ لفظی لڑائیاں جاری رہتی ہیں یہاں تک کہ ایک روز وہی باوا آدم کے زمانے کی جسمانی لڑائی اپنی بھیانک شکل دکھاتی ہے اور لوگ جوش میں آکر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو جاتے ہیں! بڑی طاقتوں کے جوش وخروش کا گرداب چھوٹی طاقتوں کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور اس

اپنجا تانی میں وہ بھی اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یورپ اس وقت لڑنے جھگڑنے والے قومی فرقوں کا ایک مجمع ہے جنہیں خود ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہئے؛ لاوال ہور مسولینی تینوں ایک خطرناک چٹان کے کونے پر اپنا سیاسی کھیل کھیل رہے ہیں اُن کے قریب ہی ہٹلر اور سٹیلن بھی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ کیا یہ سب قسمت کے مُہرے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنا شطرنج کھیلتی ہے اور انہیں معلوم نہیں کہ یہ کدھر کو چلنے والے اور کسے مات کرنے اور خود کس سے مات ہو جانے والے ہیں؛

دولِ عظمےٰ کے بعد دولِ صغریٰ کا درجہ ہے۔ اِن میں غالباً ترکی سب سے بڑا ہے۔ ترکی کمال" اتاترک" کے سائے میں نئی اصلاحات اور معاشی ترقیوں میں مصروف ہے اگرچہ بین الاقوامی فضا کے تکدّر کے باعث اُسے بار بار اپنی فوجی قوت کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے + آسٹریا ہنگری اور بلغاریہ بھی اپنے سابق حلیف جرمنی کی طرح اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے خواہشمند ہیں مگر چیکوسلوویکیا یگوسلاویا اور رومانیا کا اتحادِ صغیر اس خواہش کو ناجائز سمجھتا ہے + یونان نے اپنی جمہوریہ کو منسوخ کرکے اپنے بادشاہ کو واپس بُلا لیا ہے + چین کی بابت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ ایک خود مختار ملک ہے بھی یا نہیں؛

اس کے بعد محکوم قومیں صف باندھے کھڑی نظر آتی ہیں۔ اِن میں یقیناً سب سے بڑی" قوم" ہندوستان ہے۔ اُسے اس سال کے اندر" حکومتِ ہند کا قانون" عطا ہُوا۔ اِس حقیقت کو جان کر کہ آزادی کبھی دی نہیں جاتی لی جاتی ہے اس قانون کی بندش کا اندازہ ہو سکتا ہے پھر جس ملک میں چپہ بھر زمین پر مذہبی خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں اُس کے مستقبل کا کیا کہنا؛ مصر میں اہلِ وفد ہزار غُل مچائیں کہ ہمارا" دستور" ہمیں واپس دے دو برطانیہ مزے سے" تمدّن" کی" حفاظت" میں مگن ہے + فلسطین میں حکم بردار حکومت مقامی عربوں اور اپنے چہیتے اجنبی یہودیوں کے مناقشات میں اپنے غیر جانبدارانہ فیصلے سناتی اور اپنی معاشی ترقی کے جال پھیلاتی رہتی ہے + جزائرِ فلیپائن پر امریکہ نے ایک نئی" دولتِ عامہ" کی مُہر لگا کر دس سال میں اُسے مکمل طور پر آزاد کر دینے کا اعلان کر دیا ہے؛

قصہ کوتاہ دُنیا کی حالت اس وقت یوں بیان کی جا سکتی ہے:۔

جرمنی روز و شب اپنی برّی بحری اور ہوائی طاقت کے بڑھانے میں مصروف ہے۔

فرانس خائف ہے اس لئے وہ کسی سے اتحاد اور کسی سے مفاہمت کرنے میں مصروف ہے۔

اطالیہ مسولینیت کے نشے میں چُور ہو کر روما کی کھوئی ہوئی سلطنت کے خواب دیکھ رہا ہے۔

انگلستان کا مزاج اِن بے چینیوں کو دیکھ کر مضطرب ہے سو وہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کا راگ الاپ رہا ہے۔

رُوس سرمایہ دار حکومتوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے تاکہ اُس کا اشتمالی لائحہ عمل اطمینان کے ساتھ تکمیل کو پہنچ جائے۔

جاپان اوروں کو بغض وحسد کے جھگڑوں میں مصروف دیکھ کر اور اپنے آپ کو طاقتور اور مضبوط پاکر چین اور بحرالکاہل کے طویل وعریض اکھاڑوں میں پہلوان بن کر اُتر آیا ہے اور سب کو دعوتِ جنگ دیتا ہے کہ آؤ طاقت آزمائی کر لو!

امریکہ ہنوز اپنے صدر کی نئی معاشی اصلاحات کے تجربے میں منہمک ہے۔

چھوٹی قومیں اپنا اپنا سر چھپائے بیٹھی ہیں کہ کسی طرح بڑی قوموں کے جھگڑوں کا یہ طوفان اُوپر ہی اُوپر سے گزر جائے۔

محکوم قومیں اس وقت زور وقوت کا زور اور زیادہ پاکر دبی بیٹھی ہیں لیکن عجب کیا ہے کہ زبردست قوموں کی رقابت کے اندر سے قدرت اِن کے لئے بہتری کی کوئی سبیل پیدا کر دے!

اکثر ملکوں میں خودسر آمر برسرِاقتدار ہیں۔ خوداختیاری اور جمہوری آزادی کا حال پتلا ہو رہا ہے۔

حیاتِ اجتماعی کی جنبش کھاتی ہوئی ترازو کے ایک پلڑے میں صلح بیٹھی ہے دوسرے میں جنگ، دیکھئے کون زیادہ وزن دار ثابت ہو؛

اور سیاست ومعاشرت کے حلقوں میں کمزور و پُرزور دست وگریباں ہیں۔ مزدور سرمایہ داروں کے خلاف ہیں عورتیں مردوں کے نوجوان بزرگوں کے۔ قابض کہتے ہیں ہم مالک ہیں بے نوا کہتے ہیں قدرت کے کارخانے میں سب کا حصّہ ہے۔ ہر پُرانی شئے بھدی معلوم ہو رہی ہے اور ہر جدّت کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے!

معاشری زندگی کی رام کہانی اِس وقت کس قدر دلفریب ہے!

بشیر احمد

صدائے رُوح

چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے — باطل تیری جلوہ گری
چھوڑ بھی دے جا چھوڑ مجھے! — آہ تری شوریدہ سری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

باطل ہے، باطل ہے سبھی — نکتہ وروں کی نکتہ وری
باخبروں کی باخبری — دیدہ وروں کی دیدہ وری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

دیکھا تو دیکھا ہے یہی، — دیدہ وری کی بے بصری
پایا تو پایا ہے یہی، — باخبری کی بے خبری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

صنعت کے آئینوں میں — اہلِ ہنر کی بے ہنری
اور فطرت کے دفینوں میں — لعل و گہر کی بے گہری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

عجزِ کلاہِ درویشی، — اہلِ ریا کی کم نظری
اور غرورِ تاجِ شہی — اہلِ ہوس کی خیرہ سری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

موت سے کس کی جان چھٹی — لاکھ ہو دانا، لاکھ جری
ایک دفعہ جو سوکھ گئی — پھر نہ ہوئی وہ شاخ ہری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

میکدہ تیرا بے مے ہے — آہ دکانِ شیشہ گری!
تجھ میں بھی کیف نہیں ہے — آہ خمارِ چشمِ پری!

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

کام کوئی بھی کر نہ سکی — چارہ گروں کی چارہ گری
یوں ہی رہی عاجز تو بھی — بدنظروں کی بدنظری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

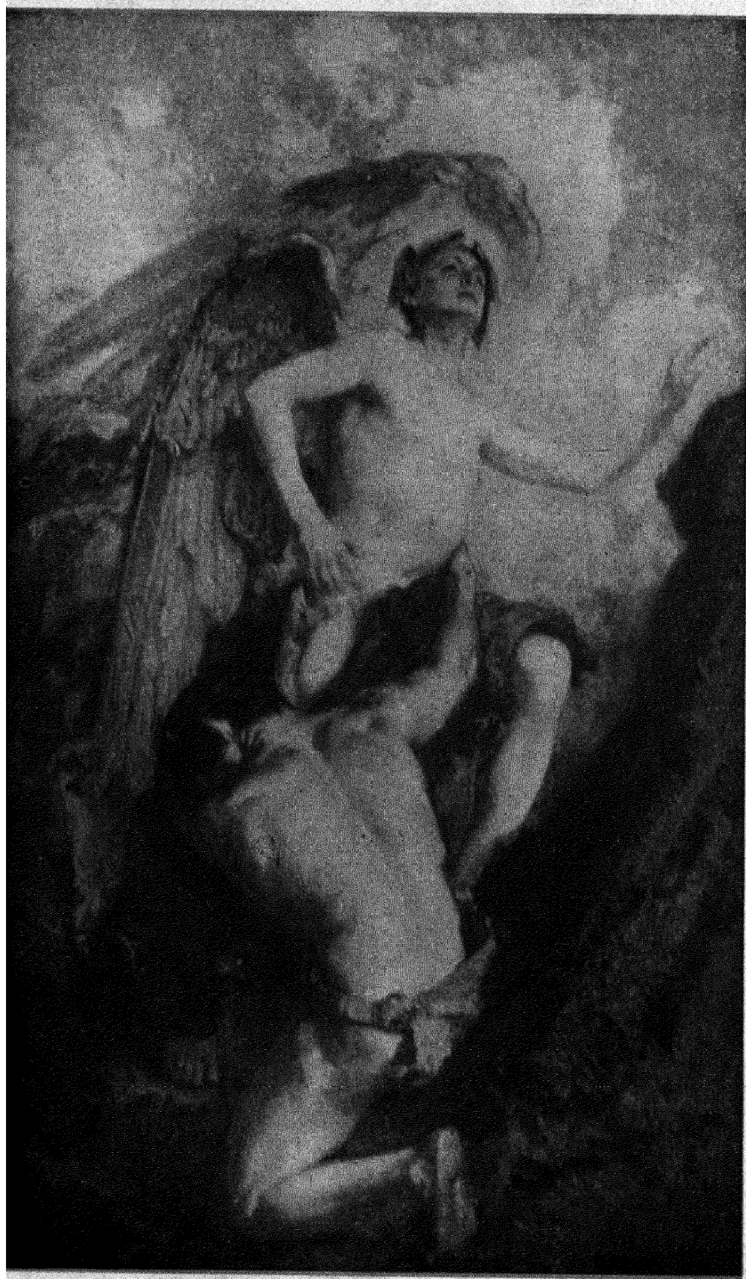
تُو تو سرے سے ناقص تھی — ناقص عقل کی بخیہ گری
تُو بھی یونہی بیکار گئی — خام جنوں کی جامہ دری

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

آہ بلندی ہمّت کی! — آہ مری بے بال و پری!
آہ تمنا رفعت کی! — آہ مری افتادہ سری!

[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

حامد علی خاں



روح اور بدی

عہدِ حاضر کے چار آمر[1]

جنگِ عظیم کے خاتمے پر اگر کوئی ہمیں بتاتا کہ آٹھ دس برس کے اندر اندر دُنیا کے بہت سے ملکوں میں بالخصوص یورپ میں بعض آمرین کے ہاتھوں آزادی اور جمہوریت کا جنازہ نکلے گا تو ہم اِس پیشین گوئی کو لغو اور ناممکن سمجھ کر محض ہنس دیتے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ قومی آزادی اور خود اختیاری کے لئے لڑی گئی، اُس کے خاتمے پر حضرتِ وِلسن نے اپنے چودہ اصُولوں کو بانگِ دُہل دُنیا کے سامنے دہرایا اور فاتح و مفتوح دونوں کو یقین دلا دیا کہ اب دُنیا بندش اور غلامی کی بیڑیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہا ہو چکی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اِس خود پسند غیرت مند بیسویں صدی میں متمدّن دُنیا کے بہت سے مُلک پھر چند دُور اندیش خود سر افراد کے پاؤں تلے دب جائیں گے اور اکثر لوگ اِس بندش کو انفرادی آزادی پر ترجیح دیں گے اور جو اس سے گریز کریں گے وہ بھی اس کے بعض شاندار نتائج پر ششدر و مبہوت ہو جائیں گے!

اس تعجب انگیز سیاسی انقلاب کے کیا وجوہ ہیں؛ مہذّب دنیا جو تقریباً ڈیڑھ سو سال سے رائے عامہ اور صدائے عامہ کے نعرے بلند کرتی رہی آخر کیا وجہ ہوئی کہ اُس نے تعلیم و ترقی کے اس عظیم الشان زمانے میں محض چند شخصوں کے جبر و استبداد کے آگے یوں ہتھیار ڈال دیئے؛ ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ وہ تھک گئی اُکتا گئی تنگ آ گئی اُسے فرار کی کوئی راہ نہ سُوجھی اُس نے سوچا یا شاید بے سوچے سمجھے لیا کہ اپنی عقل نے اور اپنے اختیار نے مجھے جس تحت الثریٰ بلکہ جس جہنّم میں پہنچا دیا ہے اُس سے اور زیادہ بُری جگہ کونسی ہوگی جہاں کسی اور کی فہم و فراست یا اختیار مجھے جھونک دے گا؛ میں ایک تاریک غار میں مقیّد ہوں جو مجھے اس میں سے نکالے میں کیوں اُس کے پیچھے نہ ہولوں؛ اور پھر ہر نئی بات میں اک مزا ہے چلیئے کوئی نئی بات آزما دیکھئے!

---

[1] آمر = Dictator

نوٹ :- اس مضمون کی تیاری میں مفصلہ ذیل کتب و رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے :- "The Post-war world" (1918 - 1934) (دنیا جنگ کے بعد) (BY Hampden Jackson)

"European Journey" (سفرنامۂ یورپ) (BY Philip gibbs)

"Great Contemporaries" (ہم عصر اکابر) (Cassell and Co)

"An Atlas of Current Affairs" (حالاتِ حاضرہ کی اٹلس)۔ (By J. F. Horrabin)

انڈین ریویو (۱۹۳۵ء)۔ ماڈرن ریویو (۱۹۳۵ء)۔

"Grey Wolf" "بھورا بھیڑیا" (یعنی سیرت کمال پاشا) (BY Armstrong)۔ وغیرہ وغیرہ

جمہوریت جس کا برابر ۱۷۸۹ء سے لے کر آج تک دُنیا میں بول بالا رہا کچھ عرصے سے اُس کی کمیاں اُس کی خوبیوں پر چھائی رہی ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ جمہوری حکومت کا نظام بہت پیچ در پیچ ہے، یہ بھی ظاہر ہُوا کہ انتخاب عامہ جس کو بہت سراہا جاتا ہے وہ کئی حالتوں میں محض برائے نام انتخاب ہوتا ہے اور پھر انتخاب اکثر صحیح یا پسندیدہ بھی نہیں ہوتا، لوگ جوش میں آکر یا غلط فہمی میں پڑ کر کسی کو منتخب کر لیتے ہیں اور بعد میں خود ہی اُس انتخاب پر حیران اور ناخوش ہوتے ہیں، اُن کا نمائندہ بارہا اُن کی مرضی کے خلاف کارروائی کرتا ہے، نمائندوں کی مجلس عموماً طول طویل بحثوں کا اکھاڑا بنی رہتی ہے، اس کے برعکس مجلس عاملہ یا وزراء عموماً جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اُن کی قوت روز بروز بڑھتی ہے وہ اور اُن کے احباب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور حکومت میں اپنی ذاتی اغراض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ عوام خوش ہوتے ہیں کہ ہم اپنے نمائندوں کے ذریعے سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نمائندے خوش ہوتے ہیں کہ ہم جو چاہیں گے حکومت سے کرائیں گے لیکن فی الحقیقت نہ عوام اور نہ اُن کے نمائندے ہی جو چاہیں کر سکتے ہیں بلکہ صرف اربابِ حکومت کرتے ہیں صرف وہی ہیں جو اپنے خیالات اور خواہشات کے ماتحت جو مناسب اور پسندیدہ سمجھتے ہیں کر گزرتے ہیں اور عموماً اُن کو روکنے والا صرف اک یہی خیال ہوتا ہے کہ ہم عوام یا کسی خاص جماعت کی رائے سے اس حد تک بے نیاز نہ ہو جائیں کہ وہ ناراض یا باغی ہو کر ہمیں حکومت سے برطرف کرنے میں کامیاب ہو جائے صحیح جمہوریت کا معیار کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کے اکثر ملکوں میں جس قسم کی جمہوریت پر عمل درآمد رہا ہے وہ ایسی ہی ہے بلکہ جمہوری حکومت کے خاص قدیمی ماویٰ وملجا انگلستان میں بھی اب جمہوریت ویسی جمہوری نہیں رہی جیسی ہُوا کرتی تھی، اب وہاں بھی ایک "متحدہ" قومی حکومت" کا قیام و استحکام مُلک کے مفاد کے لئے ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

جمہوریت کے اِس انحطاط کے اور بھی اسباب ہیں؛ جنگِ عظیم کے بعد کچھ عرصہ تو خلافِ توقع تجارت کو فروغ ہُوا، جرمنی اور آسٹریا مجبوراً اپنی بُری حالت میں بھی خاموش رہے دوسری شکست خوردہ قومیں بھی جُوں تُوں کر کے وقت کاٹتی رہیں لیکن باقی ماندہ تمام ممالک بالعموم معاشی حیثیت سے خوش حال رہے یہاں تک کہ ڈوز کمیٹی کی تجویز اور لوکارنو کے معاہدے کے بعد جرمنی اور آسٹریا بھی چار پانچ سال تک بہت اچھی حالت میں رہے، اتحادیوں نے اُن کو قرضہ دیا کہ وہ اپنی بُری حالت کو کچھ سنواریں، وہ بھی اپنے ملکی نقصانات کو بھول کر اپنی موجودہ سیاسی حالت پر قانع ہو گئے لیکن ۱۹۲۹ء میں کساد بازاری کا ایک طوفانِ عظیم سرمایہ داروں کی متمدن دُنیا پر ٹوٹ پڑا، ہزاروں بنک بند ہو گئے، شرح مبادلہ تہ وبالا ہو گئی، کاروباری اعتبار جاتا رہا اور یہ ساری کساد بازاری اُس وقت اپنی بھیانک صُورت دِکھانے لگی جب کہ بازار اجناس سے لبالب بھرا ہُوا تھا اشیا کی کمی نہ تھی بلکہ بیشی تھی لیکن اس پر بھی امیر دُنیا بھوکی مر رہی تھی۔ کاروبار والوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، حکومتوں نے

طرح طرح کے جتن کئے، بے روزگاروں کے روزینے مقرّر کئے، درآمد کے مال پر جہاں ضروری سمجھا محصُول لگادیئے، شرح زر کے لئے قانون وضع کئے کیا کیا نہ کیا لیکن معاشری سرد بازاری بد سے بتر ہی ہوتی گئی۔ ہزاروں کاروباری اُمراء دیوالیہ ہوئے لاکھوں مزدور بے روزگار ہو گئے امیر غریب ہو گئے غریب بھوکوں مرنے لگے" روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو" مرتے کیا نہ کرتے یہی خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ سارا موجودہ سیاسی و معاشی نظام ہی لغو ہے جس کا نتیجہ یہ ابتری ہے۔ اشتمالیوں نے کہا ہم نہ کہتے تھے ایک دن سرمایہ داری سب کو لے کر ڈوبے گی بس وہ دن آج آگیا ہے اب اِس طوفان میں یا جان سے جاؤ یا آؤ ہم تم کو اپنی نئی کشتی میں جگہ دیں کہ تم اطمینان کی زندگی گزار سکو۔ بعض اور چالاک آدمی تھے وہ بولے یہ جو پرانے جمہوری رہنما دُنیا کو" جو ہوتا ہے ہونے دو" کے اصول پر چلا رہے تھے اس بے راہ روی کا لازم نتیجہ تھا کہ تمدّن زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک کر اپنی جان تک کھو بیٹھے، زندگی کے لئے تمدّن کے لئے ترقی کے لئے ایک خاص مقررہ شاہراہ کی ضرورت ہے اور اُس شاہ راہ کا بنانا اُسے ہر وقت دیکھنا اُس کا ہر گھڑی سمجھنا یہ عوام بلکہ خواص کے بس کی بات بھی نہیں بلکہ یہ قوّت خواص میں بھی قدرت محض کسی کسی کو ودیعت کرتی ہے وہ خاص الخاص آدمی ہم ہیں۔ لوگ جو کمزوری و مایوسی سے نیم پاگل سے ہو رہے تھے یہ آوازہ سُن کر فوراً آمنّا وصدّقنا کہنے لگے۔

اس پر مُستزاد فاتح قوموں کا غرور و تکبّر اور خود غرضانہ کم اندیشی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں باوجود ولسن کی مساعی کے درسائی کے معاہدے کے مطابق اتحادیوں نے جس طرح چاہا یورپ کے حصّے بخرے کر دیئے۔ کہنے کو یہ طریقہ تقسیم قومیت کے زرّیں اصُول پر مبنی تھا مگر در اصل اس کی تہ میں بہت سے اور جذبات کام کر رہے تھے۔ پولینڈ لوتھینیا چیکوسلوویکیا کو جرمنی کے جو حصّے دیئے گئے اُن میں علاوہ اُن قوموں کے جرمن لوگ بھی آباد تھے، اطالیہ نے جس حِصّے پر قبضہ کیا اُس میں آسٹروی بھی تھے، رومانیہ نے جو علاقہ سنبھالا اُس میں یُوکرینی ہنگری اور دیگر قومیں بھی تھیں۔ جرمنی کے مغرب میں تو فرانس اُس کا آلساس لورین دبائے ہوئے تھا جرمنی کے مشرق میں تین نئے ملک قائم کئے گئے تاکہ وہ اُس کا زور کم کئے رکھیں اور اتحادیوں کے جانب دار بنے رہیں۔ چیکوسلوویکیا، یگوسلاویا اور رُومانیا کے درمیان ایک" اتحادِ صغیر" کی بنا پڑی۔ یہ اتّحاد اتحادیوں کے اتحادِ کبیر کا گویا بچہ اور پروردہ تھا اس کا کام تھا کہ وہ وسطی و مشرقی یورپ میں اپنے اور اتحادیوں کے مفاد کا نگہبان بنا رہے۔ پولینڈ اور لُوتھینیا کو اتحادی شہ ملی تو اُس نے رُوس کا بہت سا اور علاقہ اور اس نے جرمن شہر میمل پر قبضہ کر لیا۔ غرض اس طرح اتحادیوں کے دشمنوں جرمنی آسٹریا ہنگری اور بالشویک رُوس کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور دُور کر کے کمزور کیا گیا اور ہر ایک کی پشت پر بہت سے گستاخ نوعمروں کو سوار کر دیا گیا تاکہ اُن کو اِن نئی مصیبتوں سے مدت العمر تک رہائی نہ ملے۔ بیچارا دُور افتادہ ترکی بے بس ہو چکا تھا یونان کو اشارہ ملا کہ جا کر اپنے سمرنا کے پسندیدہ شہر اور ایشیائے کوچک کی سرزمین پر اپنا جھنڈا گاڑ دو۔ آسٹریا اور ہنگری تو غریب زار و نزار تھے

لمبی سانسیں بھریں اور پڑ رہے لیکن جرمنی کا دل خون خون ہوگیا اور ترکی کے کٹے ہوئے اعضا بھی تڑپنے لگے۔ یہ درد و اضطراب کچھ عرصہ جاری رہا لیکن انتقام کا دن دُور نہ تھا، جوش بھرے جذبات اندر ہی اندر اپنا کام کرتے رہے۔ اطالیہ کو بھی جنگ عظیم سے جو اُمیدیں تھیں وہ اتحادیوں کے ہاتھوں پوری نہ ہوئیں سو اُس نے خود ہی اِدھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کیے۔ روس میں اتحادیوں نے سفید رُوسیوں کی مدد کر کے بالشویکوں کو خانہ جنگی میں مصروف کر دیا لیکن وہاں بھی جلد ہی مُنہ کی کھانی پڑی۔ جرمنی اطالیہ ترکی رُوس! باوجود اتحادی رُکاوٹوں کے اِن قوموں نے طاقت پکڑی اور زور دکھایا کیونکہ ان چاروں ملکوں میں چار ایسے زبردست افراد برسرِ اقتدار ہو گئے کہ اُن کا شمار اگر اکابرِ عالم میں کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آج متمدن ممالک میں جمہوریت کا سر نگوں ہے، قانون ساز مجلسیں صرف نام کو باقی ہیں، پارلیمنٹیں پارہ پارہ ہو رہی ہیں، اطالیہ میں بادشاہ برائے نام موجود ہے فاشی مجلس یعنی اُس کا کرتا دھرتا مسولینی مختارِ مطلق ہے، جرمنی میں ہٹلر ہی رشتاغ ہے اور وہی قیصرِ اعظم، رُوس میں سٹیلن اور اُس کے حواریوں کا سکہ جاری ہے، یونان اپنی جمہوریہ سے اکتا کر اپنے بادشاہ کو واپس بُلا رہا ہے، ہسپانیہ اپنی نئی جمہوریہ میں روز و شب بے تاب ہے، آسٹریا نے اپنے پُرانے بادشاہوں کے خلاف جو قانون نافذ کیا تھا اب منسوخ کر دیا ہے، رُومانیا کا پُر رُومان بادشاہ خود مختاری کے مزے لے رہا ہے، تُرکی اپنے کمال پاشا کے پہلو میں مگن ہے، ایران اپنی مشروطہ پر لات مار کر ایک خودمند استبداد کے سائے میں رضی بہ رضا ہے، بلکہ جمہوری امریکہ بھی اپنے صدر رُوزولٹ کے مطلق العنانی احکام پر گوش بر آواز رہتا ہے اُدھر فرانس اور انگلستان تک میں "قومی" حکومتوں کی نیم جمہوری جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں۔ حق یہ ہے کہ دنیا کے وہ مُلک جو اس وقت مطلق العنان حکمرانوں کے زیرِ پا نہیں ہیں وہ بھی جی ہی جی میں اُن ملکوں پر رشک کھاتے ہیں جو اپنے آمرین کی قیادت میں دن دونی رات چوگنی "ترقی" کر رہے ہیں۔ یہ آمر چند گھنٹوں میں وہ احکام و قوانین نافذ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں جو جمہوری اور پارلیمنٹی ملک مہینوں اور بعض اوقات سالوں میں نہیں کر سکتے۔ آمر ایک تجویز سوچتا ہے جھٹ اُس کا خاکا بناتا ہے پھر فوراً اُس پر عمل کرنا اور کرانا شروع کر دیتا ہے، لوگ بغور اُس کا حکم سنتے ہیں اُسے سچا سمجھتے ہیں اور پھر بغیر سوچے سمجھے اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔

اِس وقت دُنیا میں زیادہ تر چار آمروں کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے ہٹلر، مسولینی، مصطفٰے کمال، سٹیلن! اور اُن کی شخصیتیں اپنے ملکوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہیں کہ اس وقت بلا مبالغہ ہٹلر کے معنی جرمنی، مسولینی کے معنی اطالیہ مصطفٰے کمال کے معنی تُرکی اور سٹیلن کے معنی رُوس ہیں!

آؤ دیکھیں کہ یہ شخص کون تھے کیا بن گئے اور اپنے ملکوں پر اور دُنیا پر اُنھوں نے کیا کیا اثرات پیدا کیے؟

ہٹلر

۲۰ر اپریل ۱۸۸۹ئہ کو آسٹریا میں برناؤ کے چھوٹے سے سرحدی گاؤں میں محکمۂ محصولات کے ایک چھوٹے سے افسر کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ ہٹلر تھا جسے ایک روز جرمنی کا مختارِ مطلق بننا تھا!

اُس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اُس کی طرح ایک سرکاری ملازم ہو لیکن ہٹلر نے جب کہ وہ ابھی صرف گیارہ سال کا تھا صاف جواب دے دیا۔ "یہ خیال کہ میں ایک دفتر میں بند رہوں ناقابلِ برداشت ہے"۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو اُس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ میں تو ایک نقاش بننا چاہتا ہوں۔ باپ نے کہا جب تک میں زندہ ہوں یہ ہرگز نہ ہوگا۔ لڑکے نے جواب دیا "اچھا آپ دیکھیں گے!" وہ تیرہ سال کا تھا کہ اُس کا باپ مرگیا۔ تین سال بعد اُس کی ماں بھی مرگئی۔ اس کے بعد نوجوان ہٹلر نے پانچ سال نہایت تنگی میں گزارے لیکن اس سے اُس کی قوتِ ارادی اور مضبوط ہوئی۔ "اُس زمانے کے لئے میں شکرگزار ہوں کہ میں نے سختی جھیلنی سیکھی اور میں سختی جھیل سکتا ہوں"۔ وہ سترہ سال کا تھا اور کُل دو پونڈ اُس کی جیب میں تھے جب وہ ویئنا کے بازاروں میں ایک مزدور بن کر اپنی روزی کمانے کے لئے آیا۔ پھر کیا عجب تھا کہ وہ بد مزاج ہوگیا اور اپنے ہم پیشہ لوگوں سے میل جول نہ رکھ سکا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہٹلر اشتراکی اصولوں کا پیرو بنے لیکن ہٹلر کا قومی غرور اُن سے برگشتہ تھا۔ وہ بعض اوقات آسٹروی پارلیمنٹ کے مباحثے سننے کے لئے جایا کرتا تھا لیکن اس سے بھی وہ جمہوریت سے روز بروز متنفر ہوتا گیا اور اُسے یقین ہوگیا کہ "اکثریتیں کبھی صحیح انسانوں کا سا کام نہیں کرسکتیں"، "سو احمق بھی مل جائیں تو ایک عقلمند آدمی نہیں بنتا"۔ اُس نے اِن دلائل سے یہ نتیجہ نکالا کہ صحیح جمہوریت کا کام محض ایک رہنما کا آزاد انتخاب ہے جو خود مکمل ذمہ داری کا فرض نبھائے اور یہودی اور مارکسی نظریہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ بجائے قدرت کے "اشراقی" اصول کے جو زور و قوت کا مؤید ہے محض عوام کی بھاری بھرکم تعداد کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنی سوانح عمری "Main Kampf" (میری جد و جہد) میں لکھتا ہے "اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ آج کل میں خدائے قدیر کے منشا کے مطابق کام کر رہا ہوں"۔

۱۹۱۴ئہ میں وہ میونخ میں تھا جب اُس نے سُنا کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ سُن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے ایسے پُرجوش زمانے میں پیدا کیا۔ وہ ہمیشہ جرمن قومیت کا دلدادہ تھا۔ اِس ڈر سے کہ کہیں اُسے آسٹروی فوج میں جبراً بھرتی نہ کر دیا جائے وہ فوراً جرمن فوج میں ایک رضاکار بن کر شریک ہوگیا۔ چار سال وہ مغربی محاذ پر لڑتا رہا اور اُس نے ۴۸ بار لڑائی میں حصّہ لیا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ئہ میں وہ زخمی ہوگیا۔ مارچ ۱۹۱۷ئہ میں جب وہ تندرست ہوکر دوبارہ محاذ پر گیا تو اُس نے دیکھا کہ جرمن فوج میں وہ پہلا سا جنگی جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ اکتوبر ۱۹۱۸ئہ میں وہ برطانوی گیس کے گولوں سے تقریباً اندھا ہو

کر جرمنی کو لوٹا جہاں ایک ماہ بعد اُس نے ہنگامی صلح کی خبر سُنی۔ وہ کہتا ہے کہ "اپنی ماں کی قبر پر کھڑا ہونے کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ میں رویا"۔

جب وہ دوبارہ اپنی رجمنٹ میں میونکھ میں شریک ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ جرمنی اب کچھ اور کا اور ہو گیا ہے۔ وہ جنگجویانہ رویہ وہ جوش و خروش اب کہاں؛ بس ہر طرف سیاست ہے اور اُس کی چالیں۔ ایک شام وہ جرمن مزدوروں کی جماعت کے ایک جلسے میں شریک تھا کہ ایک نامعلوم سے پروفیسر نے اُٹھ کر بزور تقریر کی کہ بویریا کو چاہیئے کہ جرمنی سے علیحدہ ہو کر آسٹریا کے ساتھ مل جائے۔ یہ سُننا تھا کہ ہٹلر آگ بگولا ہو گیا اور اُس نے جواب میں ایسی دھُواں دھار تقریر کی کہ پروفیسر صاحب کو دُم دبا کر بھاگتے بنی۔ اُس رات ہٹلر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا کہ اُسے کیا کرنا اور کیا بننا ہے؛

چند روز بعد جب وہ اس جماعت کے جلسے میں گیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ جماعت کے کُل رُکن سات ہیں اور اُس کا مجموعی سرمایہ صرف ساڑھے سات مارک ہے۔ ہٹلر نے ارادہ کر لیا کہ اس ذرا سی جماعت کے ذریعے سے وہ جرمنی میں اُن پرجوش اصُولوں کی اشاعت کرے گا جو اُس کے سینے میں موجزن تھے۔ اُنہوں نے ایک عام اجلاس کا انتظام کیا۔ اس میں حاضرین کی تعداد ۱۱۱ تک پہنچی ہٹلر نے وہاں اس زور سے تقریر کی کہ کھڑے کھڑے تین سو مارک چندہ جمع کر لیا۔ لیکن اس اجلاس کا ایک اور نہایت اہم اور زبردست نتیجہ نکلا، ہٹلر کو معلوم ہو گیا کہ میں واقعی ایک مُقرر ہوں۔ فروری ۱۹۲۰ء میں اُس نے ایک بڑے اجلاس کی تیاری کی۔ اس میں دو ہزار آدمی شریک ہوئے ہٹلر نے جب اپنی تقریر شروع کی تو اکثر لوگ اُس کے مخالف تھے، تقریر کے خاتمے تک اکثر اُس کے مدّاح بن گئے۔ اُس نے اپنے پچیس "۲۵ نقطے" اُن کے سامنے بیان کئے، تمام جرمنوں کو متحد ہو جانا چاہیئے جرمنی کو قومی حقوق میں برابری حاصل ہونی چاہیئے ورسائی کا معاہدہ منسوخ ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ اشتراکی تجاویز تھیں جواب اس کے "نازی" لائحہ عمل سے خارج ہو چکی ہیں۔ آئندہ تین سال میں یہ جماعت بڑھی۔ ۱۹۲۲ء میں اُس نے اشتراکی حملوں سے بچنے کے لئے اپنے اولیں "طوفانی جنگجو" مرتب کئے، بویریا کا سب سے بڑا سیاسی رہنما بن گیا اور جنوبی جرمن سرمایہ داروں اور سوداگروں نے اُس کی جماعت کو جی کھول کر چندہ دیا۔ ۱۹۲۳ء میں اُس نے برلن کی حکومت سے بیزار ہو کر اُس کے خلاف علانیہ طور پر بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اُسے قید کر دیا گیا۔ قید خانے میں اُس نے اپنی مشہور سوانحعمری "میری جدوجہد" لکھی جواب گویا نازی تحریک کی انجیل سمجھی جاتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے اخیر میں جب وہ رہا ہو گیا تو اُس نے اپنی "نازی" جماعت کو ایک قومی پیمانے پر بڑھانا شروع کیا۔ اُس نے اُوپر کے امیر طبقے اور درمیانے طبقے کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء کے اخیر تک جماعت کے ارکان ایک لاکھ تک پہنچ گئے۔ جرمن اشتمالی جماعت نے جان لیا کہ ہمیں اپنے سب سے بڑے دشمن سے واسطہ پڑا ہے دونوں طرفیں

لڑائی پر تل گئیں، پانچ سال تک لڑائی اور قتل وخون جاری رہا جس میں نازیوں کے چار سو آدمی کام آئے اور ۴۰۰۰۰ زخمی ہوئے۔ اِس عرصے میں ہٹلر کی حیرت انگیز خطابت نے لاکھوں کروڑوں جرمنوں کا دل موہ لیا۔ باہر کھُلی ہوا میں جلسے ہوتے تھے ہٹلر ایک برساتی کوٹ کے ساتھ اپنے معمولی پیروؤں کی طرح ایک معمولی سی بادامی قمیص پہنے آتا، سارے نازی اپنی وردی پہنے سپاہیانہ انداز میں شریک ہوتے " ہٹلر کی جے" کی فلک شگاف صدائیں سینوں میں دِل ہلا دیتیں۔ ہٹلر کی اِن زبردست تقریروں سے جرمنی اُس کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؛ اس کی محض یہ وجہ تھی کہ ہٹلر نے جرمن قوم کی خودداری کو پھر بیدار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ جرمن اب بھی نسلی طور پر تمدّن کا بہترین نمونہ ہیں، وہ برابر چار سال تک ساری دُنیا کے خلاف اکیلے لڑے اور کامیابی سے لڑے اور اُن کی شکست محض اُن کے اپنے ہم وطن اشتمالیوں اور یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ وہ بولا" تم جرمن ہو، دُنیا کے بہترین انسان تم ہو آؤ سب ایک ہو جاؤ اور میرے پیچھے ہولو۔ تمہاری شاندار قسمت تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔ ۱۹۳۰ء میں جب رِشتاغ کا انتخاب ہُوا تو ۶۵ لاکھ جرمنوں نے ہٹلر کے پیروؤں کے حق میں رائے دی۔

علاوہ زورِ خطابت کے ہٹلر کی اِس ترقی کے اور بھی اہم اسباب تھے۔ جرمنی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جون ۱۹۱۹ء میں ورسائی کے معاہدے کے مطابق اتحادیوں نے جرمنی کے سب کپڑے لتّے اُتار لئے اور دو سال بعد اُس پر ایک اتنا بھاری تاوان لگایا جس کا نصف صدی میں ادا ہونا بھی ممکن نہ تھا جن جرمن علاقوں کو خود اختیاری کے اصُول پر دوسروں کے حوالہ کیا گیا اُن میں رائے لینے کا طریقہ یقیناً فریب کاری پر مبنی تھا یعنی جرمنی کو دھوکا دے کر اُس کے بعض اعضا کاٹ لئے گئے اور اُسے بتایا گیا کہ یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ اگست ۱۹۱۹ء میں جرمن جمہوریہ کا "ویمر دستور" قائم ہُوا۔ اگست ۱۹۲۱ء میں تاوان مقرر ہونے کے تین ماہ بعد جرمن حکومت نے دیانتداری کے ساتھ پہلی قسط ادا کی باوجودیکہ جرمنی کی مالی حالت نہایت مخدوش تھی۔ جنوری ۲۳ء میں فرانسیسیوں نے جرمن تساہل کا عذر رکھ کر رُور پر حملہ کر دیا، جرمن حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر اتحادیوں نے ۱۹۲۴ء میں ایک ڈوز کمیٹی بٹھائی تاکہ جرمنی کو اپنی حالت درست کرنے میں مدد دی جائے۔ مدعا اس کا محض یہ تھا کہ مقروض جرمنی کہیں دیوالیہ نہ ہو جائے مبادا اُس کے قرضخواہ لوٹ مار سے محروم رہ جائیں۔ اس کمیٹی کی تجاویز کے مطابق جرمنی کو کچھ قرضہ دیا گیا تاکہ وہ اپنے گھر بھر کی کچھ درستی کر سکے۔ ۱۹۲۵ء میں لوکارنو کے معاہدے کے مطابق جرمنی نے بخوشی دریائے رائن کی سرحد کو قبول کر لیا۔ ان سمجھوتوں کے باعث جرمنی کی حالت سُدھرنی شروع ہوئی لیکن حق یہ ہے کہ یہ فلاح وبہبود محض ظاہری تھی بلکہ ویمر کے دستور کے مطابق حکومت نے جو آزاد خیالی کا رویّہ اختیار کیا اُس کا نتیجہ بھی محض قومی تفریق اور مایوسی ہُوا۔ اس کے بعد جب ۱۹۲۹ء میں ساری متمدن دُنیا پر کساد بازاری کا طوفان ٹوٹا تو ڈوبتے جرمنی کو جو تنکے کا سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں جمہوریہ کی مخالفت بڑھتی گئی۔ نازیوں کو فروغ ہُوا اور جب ۱۹۳۱ء میں جرمن بنک یکے بعد دیگرے ٹوٹنے شروع ہوئے تو اس

کس مپرسی کے عالم میں ہٹلر آدھمکا۔ قدرتی بات تھی کہ ایک ایسے وقت میں ایک ایسا رہنما لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن جائے!

ہٹلر کی اپنے پیروؤں کو ہمیشہ یہ ہدایت تھی کہ "تمہیں بازاروں کو فتح کرنا ہے"۔ اُس کے منظم طوفانی جنگجوؤں" کا مقابلہ ناممکن تھا، ہٹلر نے یہ بات تاڑلی سو اُس نے ارادہ کر لیا کہ بجائے تشدد کے وہ رضامندی کے ساتھ حکومت پر قابو پائے گا۔

۱۹۳۲ء میں اُسے ہر دلعزیز صدر جمہوریہ ہنڈن برگ کے مقابل میں تیس چالیس فی صدی ووٹ ملے۔ جرمن چانسلر نے اُسے اپنا نائب چانسلر بننے کی دعوت دی، ہٹلر نے انکار کر دیا۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمن چانسلر بن گیا۔ نازیوں کے ہزاروں جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلے اور اکثر لوگ ہنڈن برگ اور ہٹلر کے لئے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔

اس کے بعد دو واقعات ہوئے جن سے ہٹلر جرمنی کا مختارِ مطلق بن گیا۔ ۳۰ رجون ۱۹۳۴ء کو اُس نے اپنے بعض رفقا اور "طوفانی فوج" کے بعض رہنماؤں کو قتل کرا دیا۔ جرمنی میں ایک سنسنی پھیل گئی مگر کسی نے ایک لفظ ہٹلر کے خلاف نہ کہا بلکہ عام خیال بھی یہی تھا کہ یہ "جبر شدید تھا لیکن ضروری"۔ اگست میں ہنڈن برگ مر گیا اور ہٹلر نے بیک وقت اپنے چانسلر اور صدر جمہوریہ ہونے کا حکم سنایا اور جرمن قوم نے اُس کے اس مستبدانہ فعل پر سمعنا و اطعنا کہہ دیا۔

۱۹۳۴ء میں جرمنی کا حکمران بن کر ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے علاقہ سار حاصل کرنے کے بعد دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ جرمنی دوسری قوموں کے ساتھ برابری کا دعویٰ دار ہے اس لئے تا وقتیکہ دوسری قومیں اپنی فوجی طاقت کو کم نہ کریں جرمنی از سرِ نو اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتا چلا جائے گا تاکہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ انجمن اقوام نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن جرمنی انجمن اقوام کو چھوڑ چکا تھا، اُس نے اس کی ذرا پروا نہ کی۔

اِس وقت ہٹلر کی قوت حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی ہے کیونکہ اُس نے جرمنی کو یورپ میں بدرجہا زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ فرانس اُس سے خائف ہے۔ انگلستان کے ساتھ اُس نے بحری طاقت کے متعلق سمجھوتا کر لیا ہے۔ اطالیہ کے متعلق اُس نے اعلان کر دیا ہے کہ جرمنی حبشہ کے معاملے میں دخل نہ دے گا جس سے شبہ پڑتا ہے کہ اطالیہ کے ساتھ اُس کی کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے۔ جرمنی کی بری طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اُس کی ہوائی طاقت انگلستان سے زیادہ ہے۔ شہروں سے دُور جرمن دیہات میں جابجا یہ اشتہار لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں:۔

"جو جرمنی کی ہوائی طاقت کی مدد کرتا ہے وہ جرمنی کی مدد کرتا ہے"۔

"جرمن قوم کو ہوا باز بننے کی اُمنگ پیدا کرنی چاہیئے"۔

ہٹلر کے نشر و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ دن رات بازاروں میں قہوہ خانوں میں تفریح گاہوں میں پبلک باغات میں "آواز رسانوں"

کے ذریعے سے بار بار یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچائے جاتے ہیں :۔ "جرمن لوگ" . . . . "ہمارا رہنما" . . . . "جرمن نصیبہ" . . . . "رفاقت" . . . . . "اتحاد" . . . . "خدمت" . . . . "ہٹلر ! . . . . ہٹلر ! . . . . ہٹلر" ——— فلپ گبز کہتا ہے میں ایک دن میں یہ الفاظ سنتے سنتے تھک گیا۔ کیا جرمن قوم ایک سال کے بعد بھی ابھی اِن سے اُکتا نہیں گئی۔ مگر جرمن قوم کے دِل کی حالت کچھ اور ہے۔ اُن کا ملک عملی طور پر اتحادیوں کا غلام ہو چکا تھا اور اِس غلامی سے رہائی کی کوئی صُورت نظر نہ آتی تھی، وہ اپنی خودداری کھو چکے تھے، مایوسی کے بادل اُفق پر چھائے رہتے تھے کہ ہٹلر رعد کی کڑک بن کر اُن کی آبادی میں آیا، اُمید نے اُنہیں پھر زندہ کر دیا !

ہٹلر کہتا ہے "ہم دُنیا کو فتح کرنا نہیں چاہتے، ہم تو صرف اپنے وطن کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امن پکارتے ہیں اور ہمارا مدعا بھی امن ہی ہے لیکن اصلی امن محض مساوی حقوق اور تحفظ کے ذریعے سے قائم ہو سکتا ہے"۔

اُس نے لیگ کو چھوڑا کہ وہاں برابری نہیں اور محض بک بک جھک جھک ہوتی ہے۔ وہ یہودیوں کا جانی دشمن ہے بیسویں صدی میں نازی جرمنی نے ان کے ساتھ وہ شرمناک ناروا داری دکھائی ہے جس سے پندرھویں سولھویں صدی کے بھیانک واقعات پھر تازہ ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہٹلر اِن سے دشمنی کرنا جرمن نسل کے فروغ کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

ہٹلر جرمنی کے نوجوانوں کا بُت ہے جس کی وہ اندھا دُھند پرستش کرتے ہیں۔ وہ زور و قوت پر زور دیتا ہے، وہ شور مچاتا ہے، وہ جلسوں جلوسوں میں شریک ہونے کیلئے انتہائی سرعت کے ساتھ جرمنی کے ایک شہر سے دوسرے شہر کو اُڑتا چلا جاتا ہے ، وہ خودداری اور اُمید اور اعتمادِ نفس کا ڈنکا بجاتا ہے پھر شباب جو زور و قوت، شورش و سرعت اور خودداری اور اعتمادِ نفس اور اُمید کا سرچشمہ ہے کیونکر اُس کی طرف کھچا نہ چلا جائے ۔ بڈھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ جو امن و امان کے خواہشمند ہیں طوعاً و کرہاً خاموش ہیں اور کاروباری آدمی ملک کی معاشی تنگ حالی سے نالاں ہیں لیکن جوان صرف مطمئن نہیں بلکہ خوش ہیں اور پُرجوش اور مصروفِ عمل۔ اُن میں خدمت کا مادہ پیدا ہو گیا ہے، شبابی تحریک جرمنی میں اپنے زوروں پر ہے، طلبہ مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ مِل جُل کر کام کرتے ہیں، "مشترک قوم مشترک حفاظت" یہ الفاظ اُن کے کانوں میں گونجتے ہیں اور اُن کے دِل اُمید سے لبریز ہیں کیونکہ اُن کی آنکھیں دُور جرمنی کے شاندار مستقبل پر لگی ہیں جس کی تصویر ہٹلر نے اُن کے سامنے جھلکائی ہے !

ہٹلر جرمنی کو دُنیا کی سب سے بڑی قوم بنانے کا خواہاں ہے اور اُسے یقین ہے کہ قدرت نے اُسے محض اِسی مطلب کے لئے پیدا کیا ہے۔ اُس کی زندگی نہایت خشک اور سادہ ہے ۔ وہ ترکاری نوش ہے، وہ نہ سگرٹ پیتا ہے نہ شراب ۔ وہ کسی قسم کی ورزش بھی نہیں کرتا صرف وہ موسیقی سے اپنی تفریح حاصل کرتا ہے۔ وہ دِن بھر مصروف رہتا ہے اور کھانے اور چائے پارٹیوں میں شریک نہیں ہوتا ۔ وہ عموماً اپنے طوفانی جنگجوؤں کی سی وردی پہنے رہتا ہے اور اس کے سینے پر ایک آہنی صلیب لٹکتی ہے۔ وہ شان و شوکت

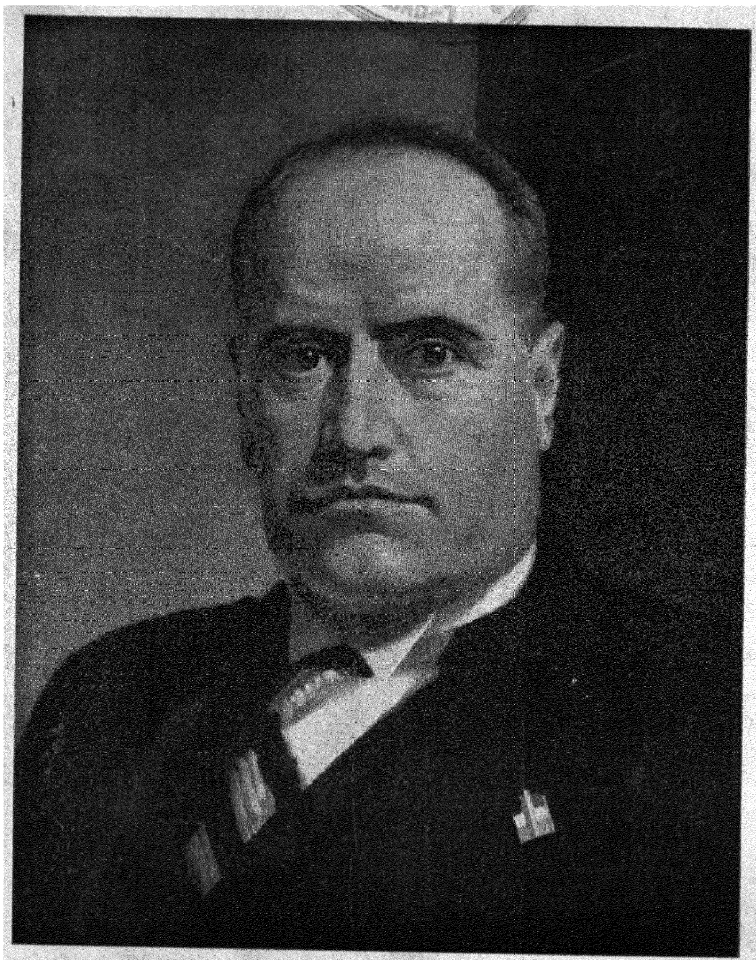
سے گریز کرتا ہے اور اپنے آپ کو صرف "طوفانی جنجگو" ۱؎ پکارتا ہے۔ وہ بہت متین ہے۔ بے تامل گفتگو کرتا ہے وہ کبھی مسکراتا نہیں سوائے اُس وقت کے جب کوئی بچہ اُسے پھولوں کا ہدیہ دے!

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ساڑھے چھ کروڑ آدمیوں کا یہ مطلق العنان حاکم آج مر جائے یا رُوپوش ہو جائے تو اُن کے مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑے؟

مسولینی

اگرچہ اطالیہ جنگِ عظیم میں فاتح اتحادیوں کے ساتھ ہو کر لڑا مگر لڑائی کے انجام پر وہ فی الحقیقت ایک شکست زدہ سا ملک تھا۔ میدان جنگ میں اطالوی عموماً پسپا ہوتے رہے، یوں بھی مدتوں سے اُن کی بُزدلی ضرب المثل تھی، اسی لئے صلح ہونے پر اتحادیوں نے اُن سے اپنے وعدے پورے کرنا ضروری نہ سمجھا۔ جنگ کے بعد اطالیہ کی معاشی حالت روز بروز اور بھی خراب ہوتی گئی۔ ہڑتالیں پہلے سے بھی زیادہ عام ہو گئیں اور اشتراکی جماعت حکومت کو تہ و بالا کرنے لگی۔ پارلیمنٹی نظام جو انگلستان کے نمونے پر قائم کیا گیا تھا ملک کی فضا کے لئے ناموزوں تھا، دارالنائبین میں عموماً تنازعات برپا رہتے تھے، صنعتی ترقی سے ملک میں بےچینی بڑھ گئی تھی، نچلے طبقے اپنی حالت سے خوش نہ تھے اور اشتراکیوں نے ملک کے طول و عرض میں ایک اُودھم مچا رکھا تھا۔ یہ حالت تھی جب مسولینی نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء میں اپنے اخبار کے دفتر میں پہلی فاشی جماعت کی بنا ڈالی۔

یہ مسولینی جس کا خاندان کسی زمانے میں متوسط درجے کا تھا ایک دیہاتی لوہار کا بیٹا تھا۔ وہ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہُوا۔ اُس کی تعلیم و تربیت ایسی تھی کہ ملک اور خاندان کے قواعد کی پابندی کی اہمیت گویا اُس کی گھٹی میں تھی اور یہی چیزیں بعد میں اُس کے فلسفۂ فاشیت کی بنیاد قرار پائیں۔ اوّل اوّل وہ ایک نائب معلّم بنا لیکن ایک سال کے بعد وہ کسی اور نئے کام کی تلاش میں سوئٹسان کو چلا گیا، اس وقت اُس کی جیب میں تقریباً دو لیرے تھے اور کچھ دیر وہ معمار کا کام کرتا رہا۔ لیکن ابھی اُس کا دل کسی خاص ٹھکانے نہ لگتا تھا اور وہ عموماً اشتراکی کتابیں پڑھتا اور انقلابی تحریکوں میں حصّہ لیتا چنانچہ اِسی سلسلے میں آئندہ چند سال میں وہ پہلے سوئٹسان سے پھر فرانس سے اور پھر آسٹریا سے ملک بدر کیا گیا۔ مسولینی کے لئے یہ سارا وقت ضائع نہ ہُوا بلکہ اس زمانے میں دُنیا اور دُنیا والوں سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا ماہر بن گیا اور سیاسی حالات سے بخوبی واقف ہو گیا۔ اسی لئے جب وہ اطالیہ میں واپس پہنچا تو اُسے بغیر دقت کے ایک اشتراکی اخبار کی ادارت کا کام مل گیا۔ اس کام کو اُس نے ایسی خوش اسلوبی سے نبھایا کہ ۱۹۱۲ء میں وہ اطالیہ کے سب سے مشہور اشتراکی اخبار "اوانتی" کا مدیر منتخب ہُوا۔ وہ اشتراکیوں کو اُکساتا رہا کہ وہ کچھ کر دکھائیں لیکن یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اشتراکیت اُس کی نظروں میں بجائے خود کوئی اعلےٰ شئے نہ تھی بلکہ وہ تھی محض ایک



موسولینی



هتلر

ذریعہ اُس کے وطن کے فروغ و کمال کا۔

جنگِ عظیم چھڑنے پر مسولینی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اگر اطالیہ غیر جانب دار بنا رہا تو اُس کی رُوح گویا کھو جائے گی۔ اُس نے اشتراکی اخبار کی ادارت چھوڑ کر خود اپنا ایک اخبار "اِل پوپولو دِطالیہ" (اہلِ اطالیہ) جاری کیا۔ اشتراکی جماعت نے اُسے اپنے دائرے سے خارج کر دیا، اُس نے اِن قابلِ یادگار الفاظ میں اُن کا جواب دیا "آج رات تم مجھے اپنے دائرے سے اور اطالیہ کے چوکوں اور بازاروں سے خارج کرنے لگے ہو۔ بہت خوب، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں بولنا بند نہیں کروں گا اور چند سالوں میں اطالیہ کے تمام لوگ میرے پیچھے ہولیں گے اور مجھ پر تحسین و آفرین کہیں گے اور تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں"۔

۱۹۱۵ء میں اطالیہ جنگ میں شریک ہوا۔ مسولینی کو بھی بھرتی کا حکم ملا۔ فروری ۱۹۱۷ء میں وہ زخمی ہو کر واپس آیا اور پھر اپنے اخبار کا کام کرنے لگا۔ صلح ہوگئی لیکن جب اطالیہ کو غنیم کے اموال و ممالک میں سے بہت کم حصہ ملا تو اہلِ اطالیہ صلح کے نتائج سے سخت بیزار ہو گئے۔ ملک میں بے چینی پھیلی اور اشتراکی جماعت نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ مسولینی نے تاڑ لیا کہ اِن "سرخ" لوگوں کا زور صرف زور و قوت سے ہی ٹوٹ سکتا ہے، چنانچہ اُس نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملان میں اپنے اخبار کے دفتر میں پہلی فاشیو یعنی فاشی جماعت کی بنا ڈالی اور اُس دن سے اشتراکیوں کے خلاف روز و شب ایک بے پناہ جنگ شروع کر دی۔ پہلے اس کام میں دقتیں پیش آئیں لیکن فاشی جنگ قائم رہی اور بتدریج عوام الناس اشتراکیت سے بیزار اور فاشیت کے دلدادہ ہونے لگے۔ حکومت بھی اشتراکیت سے خائف تھی سو اُس نے بھی دخل نہ دیا۔ یہاں تک کہ آخر کار ۱۹۲۲ء میں فاشیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں چنانچہ ۳۰ اکتوبر کو مسولینی کی قیادت میں ۵۰،۰۰۰ فاشی روما کے شہر میں داخل ہوئے اور بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے اُس پر قابض ہو گئے۔ حکومت پسپا ہوگئی۔ بادشاہ نے مارشل لا جاری کرنے سے انکار کیا اور دار النائبین نے مسولینی کی کارروائی کو جائز قرار دیا۔ اُس دن سے آج تک اطالیہ کا اصلی حاکم صرف مسولینی رہا ہے!

تین سال تک مسولینی کا کام ہر ممکن ذریعے سے اپنے مخالفین کی سرکوبی کرنا رہا۔ ۱۹۲۳ء میں فاشی جبر و ظلم یعنی مار پیٹ، لڑائی بھڑائی کیسٹر آئل (جُلّاب) کی زبردستی خوراکیں یہ سب کچھ جاری رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ملکی مجلس کے ایک ہر دلعزیز اشتراکی رکن کے قتل سے ناراض ہو کر جمہوری جماعتیں مسولینی کے خلاف متحد ہو گئیں۔ یہ کشمکش تھوڑی دیر جاری رہی لیکن سال کے اخیر تک جب ڈوز کمیٹی کی تجاویز کے بعد وسطی یورپ میں امن و امان قائم ہو گیا تو مسولینی کے مخالفین کا بھی قلع قمع ہو گیا۔

اب اطالیہ کی فاشی تعمیر و تنظیم شروع ہوئی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک اور بعد میں ملکی مجلس کے ذریعہ سے وہ قوانین نافذ ہوئے جن کے طفیل آج مسولینی وزیرِ داخلہ وزیرِ خارجہ وزیرِ ہوا وزیرِ بحر وزیرِ تجارت وزیرِ صنعت وزیرِ نوآبادیات وزیرِ جنگ اور وزیرِ اعظم سب کچھ ہے۔ ملکی مجلس ہیچ ہو گئی کیونکہ قانون سازی کا اختیار فاشی مجلسِ عظمیٰ کے سپرد کر دیا گیا جو ۱۹۲۹ء میں باقاعدہ طور پر ملکی دستور کا جزو قرار

U766

دی گئی۔ انتخاب کا طریقہ یک قلم تبدیل کر دیا گیا، تجارتی شخصیبے فاشی مجلس کے سامنے کچھ نام پیش کرتے ہیں مجلس اس فہرست میں کچھ اور نام داخل کر کے پھر ان ہزار بارہ سو ناموں میں سے چار سو اشخاص چن لیتی ہے۔ پھر قوم کی طرف سے ایک نام نہاد انتخاب ہوتا ہے جس میں ساری قوم انہیں چار سو اشخاص کو اپنے نمائندے قرار دیتی ہے، یوں منتخب ہوتا ہے اور یوں وجود میں آتا ہے اطالیہ کا دارالعوام۔

اطالیہ ایک مفلس ملک تھا۔ مسولینی نے اس کے افلاس کو دور کرنے اور اسے دوسروں کی امداد سے آزاد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ گیہوں کی پیداوار بڑھائی جائے، برقی قوت میں اضافہ کیا جائے، ہڑتالوں کے مرض کا سدباب کیا جائے۔ اس کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ زراعت، صنعت، مالیات، محنت غرض کہ قوم کی ساری معاشی زندگی میں ایک مرکزی انضباط قائم کیا جائے مشین کے سارے پرزے ایک ہتھی کے اشارے پر کام کریں اور وہ ہتھی مسولینی کے ہاتھ میں ہو۔ مزدوروں کی انجمنیں منسوخ کر دی گئیں اور ہر مقامی صنعت کے لئے ایک آجروں کی اور ایک مزدوروں کی مجلس تجویز کی گئی لیکن ان میں صرف انہیں مجلسوں کو منظور شدہ قرار دیا گیا جو فاشی عقیدہ رکھتی ہوں۔ ان مقامی مجلسوں کے اوپر صوبجاتی اور ان کے اوپر قومی مجلسیں اور پھر سب کے اوپر شخصیات کی ایک بڑی قومی مجلس قائم کی گئی۔ اس نوجی سے نظام کا قائد اعظم مسولینی تھا۔ یہ تھی ۱۹۲۷ء کی مشہور "سند محنت"۔ یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ فاشی مجلس عظمیٰ مسولینی کا جانشین بھی منتخب کر چکی ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے تین شخص منتخب کئے جن میں سے بادشاہ مسولینی کی موت یا علیحدگی پر ایک شخص کو چن لے گا۔

یہ تھا فاشیت کا ڈھانچا اور اس کی روح تھی فاشیت کا عقیدہ۔ اس عقیدے پر کامل طور پر اعتقاد کرنا اور کرانا یہ رہا ہے گذشتہ دس سال میں مسولینی اور اس کے فاشیوں کا کام اور اس کے سرانجام دینے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کوئی اچھا برا ذریعہ نہیں جو انہوں نے استعمال نہ کیا ہو۔ بچے انہیں سکولوں میں جاتے ہیں جہاں فاشیوں کے مداح معلم ہوتے ہیں، وہ ایسی ہی کتابیں پڑھتے ہیں جو فاشی عقیدے کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ ان کے پیش نظر ہر وقت حضرت مسولینی کی تصویر رہتی ہے اور انہیں دیواروں پر بار بار یہی فقرہ لکھنا سکھایا جاتا ہے کہ "مسولینی ہمیشہ راستی پر ہے"۔ سب سے تعجب انگیز بات یہ ہے کہ انہیں گیت گانا سکھایا جاتا ہے کہ اطالیہ ہی تھا جس کے ہاتھوں وتوریو ونیتو کے میدان میں جنگ عظیم میں فتح حاصل ہوئی اور سکول کے باہر لڑکے لڑکیوں کو فوج کی صورت میں قواعد سکھائی جاتی ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ فاشی جماعت کے رکن بن سکتے ہیں۔ اسی طرح تمام اخبارات فاشی جماعت کے اختیار میں ہیں۔ ہر ایک کے پہلے صفحے پر ایک ہی طرح کے فاشی اعلانات، فاشی جلسوں جلوسوں کا ہو بہو ایک ہی طرح کا بیان شائع ہوتا ہے۔ فاشی عقیدہ مختصراً یہ ہے "میں مملکت کا معتقد ہوں جس کے باہر میں کبھی پوری مردانگی حاصل نہیں کر سکتا۔ مجھے اطالیہ کے اس مقدس نصیبے پر اعتقاد ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ روحانی اثر پیدا کر سکتا ہے میں ال دوچے (مسولینی)

شخصیبے۔ Corporations۔ سند محنت۔ Labour Charter۔

کا تابع رہوں گا کیونکہ بغیر متابعت کے صحت ممکن نہیں"۔ یہ ہے اطالوی فاشیت۔ مسولینی کے خیال کے مطابق فاشیت بین الاقوامیت نہیں ہے خواہ بین الاقوامیت اچھی ہو یا بری اور وہ اشتراکیت نہیں ہے بلکہ وہ اشتراکیت یا "مارکسیت" کے عین منافی ہے جو ہمیں انسانی معاشرہ کے طبقات میں ایک لازمی جنگ اور بے پناہ کشمکش کا یقین دلاتی ہے۔ اور نہ فاشیت ہے جمہوریت جس کے مطابق ارکان فقط ارکان ہونے کے باعث انسانی معاشرہ کے رہنما بن جاتے ہیں اور گاہے گاہے کسی مشورت کے ذریعے حکومت کرتے ہیں۔ بلکہ فاشیت نوعِ انسان کی مفید اور دائمی عدمِ مساوات کی حامی ہے جو محض اِک عالمگیر رائے دہندگی سے دُور ہو سکنے والی شے نہیں۔ اور نہ فاشیت ہے "امن پسندی"، اور فاشیت کو عالمگیر صُلح میں یقین نہیں کہ یہ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ اِسی لئے فاشیت "امن پسندی" کو جس کے معنی فقط مغلوبیت اور بُزدلی ہیں لغو سمجھتی ہے۔ صرف جنگ ہی ہے جس سے انسان کی تمام توانائی اپنی قوی ترین حالت میں آتی ہے اور اُن لوگوں پر شرافت کی ایک مُہر لگا دیتی ہے جن میں اتنی ہمّت و شجاعت ہو کہ وہ اُس سے دلیرانہ دوچار ہو سکیں! "مجھے دائمی صلح میں ذرہ برابر یقین نہیں، وہ انسان کے بہترین اوصاف کے منافی ہے کہ ان اوصاف میں اگر آب و تاب پیدا ہوتی ہے تو صرف جدّ و جہد سے۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اطالوی قوم اپنے مستقبل کا مکمل پابندیٔ قواعد کے ساتھ سامنا کرے گی"۔

پاپائے روما کے ساتھ جو اطالوی حکومت کا برسوں سے تنازعہ تھا وہ مسولینی کی کوشش سے ۱۹۲۹ء میں خوش اُسلوبی کے ساتھ طے ہو گیا۔ کیتھابیت کو یہ اختیار نہ رہا کہ وہ جس طرح چاہے اطالویوں کی تعلیم میں دخل دے۔ اخلاقی و مذہبی تعلیم کے ساتھ حکومت نے طلبہ میں قوت و ہمت کے جذبات پیدا کرنے کا حق حاصل کیا۔ پاپا کو اُس کے مختصر سے شہر کی چار دیواری میں خود مختار تسلیم کر لیا گیا۔ یوں مسولینی نے پاپا سے صلح کر لی اور اُس کے مدّاح کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے بھی اہم معاملات میں عموماً "مشورہ" لیتا ہے۔

مسولینی نے معاملاتِ خارجہ کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے اور اپنی قوت کے مظاہروں اور سیاسی جوڑ توڑ سے اطالیہ کو یورپ میں پہلے سے بدرجہا زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ اختیار حاصل کرتے ہی مسولینی نے یونان سے ایک تنازعہ کے سلسلے میں یونانی جزیرے کورفو پر گولہ باری کی، بغیر اتحادیوں کی اجازت کے یگوسلاویا سے سمجھوتا کر کے فیوم کے شہر پر قبضہ کر لیا اور البانیا کے آزاد ملک کو مالی مدد دے کر اُس کو اطالیہ کے سایۂ غلامی میں لے لیا۔ اس کے بعد اُس نے فرانس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ فرانس میں دس لاکھ کے قریب اطالوی مزدور کام کرتے تھے اور فرانس کی نوآبادی طونس میں اطالوی زیادہ تھے فرانسیسی کم۔ ان کی موجودگی تشویش کن تھی۔ نیز اطالیہ اپنے طرابلس کے علاقے کو وسیع کرنا چاہتا تھا۔ فرانس ان باتوں سے ناراض تھا۔ اُدھر مرکزی یورپ میں فرانس "اتحادِ صغیر" کی پشت پناہ بنا ہوا تھا اور اطالیہ کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کے مقابل میں اطالیہ نے بتدریج آسٹریا اور ہنگری سے جو اب کمزور ہو چکے تھے رسم و راہ بڑھائی

مارکسیت = Marxism ۔ اشتمالیت = Communism ۔

اشتراکیت = Socialism ۔ (اشتمالی مارکس کے نظریے کے معتقد ہیں)

اور جرمنی کے مقابل میں ہو کر آسٹریا کی آزادی پر اصرار کیا۔ یورپ کی قومیں اطالیہ کی بے نقاب کھُلی عسکریت سے خوف کھانے لگیں۔ مسولینی نے بہت سے حربی کارخانے قائم کئے فوج کو بڑھایا اور ۵۰۰ جنگی طیارے تیار کئے گو ساتھ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا رہا کہ اطالیہ تخفیف اسلحہ کا حامی ہے۔

مسولینی لیگ اقوام کا مویّد نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ لیگ فقط تدبیر کا ایک معمولی سا آلۂ کار ہے وہ دول عظمٰے کے اوپر کوئی عظیم ترین دولت بن کر قائم نہیں ہو سکتی۔ اور وہ معاہدوں کی دائمی بندش سے آزاد رہنا چاہتا ہے چنانچہ اُس نے ایک دفعہ ملکی مجلس میں بہ حیثیت وزیر اعظم کے کہا کہ "معاہدے ازلی نہیں ہوتے کہ تبدیل نہ کئے جا سکیں۔ وہ فقط تاریخ کی کتاب کے ابواب ہیں وہ اُس کا خاتمہ نہیں"۔ "دول اربعہ کا معاہدہ" جس کے مطابق برطانیہ فرانس جرمنی اور اطالیہ نے یورپ کے مسائل پر غور و پرداخت کا تہیہ کیا خاص مسولینی کا منصوبہ ہے۔ مختصر یہ کہ مسولینی نے اطالیہ کو دول عظمٰے کے دائرے میں ایک زبردست دولت بنا دیا ہے بلکہ حال میں (اکتوبر ۱۹۳۵ء میں) ساری دُنیا کی متفقہ آواز کے خلاف معصوم کمزور حبشہ پر چڑھائی کر کے اُس نے اپنی قوت تکبّر اور خودسری کا پورا پورا ثبوت دے دیا ہے۔ بلاشبہ اس ظالمانہ جنگ کے نتیجے ہولناک ہوں گے لیکن مسولینی کا خیال ہے کہ انگلستان اور فرانس کو جو خود گزشتہ سو سال میں دُنیا کے اکثر حصّوں پر بزور قابض ہو چکے ہیں زیبا نہیں کہ وہ اطالیہ کے اس جبر و تشدد پر چیں بہ جبیں ہوں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم فرانس اور جرمنی کے ساتھ اطالیہ کا کوئی خفیہ سمجھوتا اس بارے میں ہو چکا ہے۔ یہ سب حضرت مسولینی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسولینی بڑا ہوشیار اور چالاک اور زبردست مدبّر ہے اور اُس نے کامیابی کے ساتھ زور و جبر کے مظاہروں سے اپنی اور اطالیہ کی قوت کا بُت عین متمدن دُنیا کے چوک میں جا کر نصب کر دیا ہے لیکن عموماً بالآخر ایسے جابروں کے غرور کا سر نیچا ہو کے رہتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے؛

مسولینی نے اطالیہ کو قوی بنا دیا ہے۔ اطالوی قوم میں پہلے کی نسبت تنظیم، محنت، خودداری اور ہمّت کی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُس میں جوشِ زور آزمائی اور تُندخوئی کے اوصاف رُونما ہیں۔ یہ اوصاف کچھ اچھے ہیں کچھ بُرے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اِس حیرت انگیز انقلاب کا نتیجہ کیا ہوگا؛

(باقی) بشیر احمد

چھوڑ سب کچھ بھُول جا آرام لے

آدمی بن اور خدا کا نام لے

ب۔ل

شام کی بزم آرائیاں

بھائی صاحب! [illegible] نقل کرا کے روانہ کر رہا ہوں، [illegible]
[illegible] آپ دیکھ نہیں رہے [illegible] انداز تحریر
میں کس قدر [illegible] ہے دماغ [illegible] اور دل زخمی ہے
[illegible] نقل کر رہا ہوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

جھٹپٹا ہونے لگا تاریکیاں چھانے لگیں	بدلیاں جنگل میں اک وحشت سی برسانے لگیں
صبح کی رنگینیاں خوابِ پریشاں ہو گئیں	ظلمتیں غمگیں فضا میں بال بکھرانے لگیں
پھول کملائے، چراگاہوں کا رنگ اُڑنے لگا	ساحلِ خاموش پر مایوسیاں چھانے لگیں

تیرگی پھیلی، درخت اک دوسرے سے مل گئے
دہشتیں صحرا کے دل میں پیچ و خم کھانے لگیں

کروٹیں لیں یوں شفق نے آسماں پر جلد جلد
ناگنیں سی سبزۂ خودرو پہ لہرانے لگیں

طائروں نے پر سمیٹے جھک گئیں شاخیں تمام
سو گئے ذرّے ہوائیں آنکھ جھپکانے لگیں

رُک کے دریا روح سے سرگوشیاں کرنے لگا
تھم کے موجیں چرخ کو آئینہ دکھلانے لگیں

پھر گھنے جنگل میں چھیڑا غم کی دیوی نے ستار
پھر خنک تاروں کی آنکھیں اشک برسانے لگیں

پھر خموشی کی حدیثِ غم نے بسمل کر دیا
پھر شفق کی داستانیں خون رُلوانے لگیں

جتنی چوٹیں دل پہ کھائی تھیں اُبھر آئیں تمام
جتنی شکلیں دل میں پنہاں تھیں نظر آنے لگیں

پھر کسی عشوے کا پرتو، روح میں غلطاں ہوا
پھر کسی محفل کی شمعیں دل میں تھرّانے لگیں

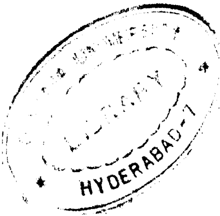
پھر تخیل کو اندھیرے نے سجھایا راستہ
پھر تصوّر میں گھٹائیں برق چمکانے لگیں

تیرگی نے پھر منوّر کر دیا قصرِ دماغ
ظلمتیں پھر حافظے میں نور دوڑانے لگیں

میٹھا میٹھا درد پھر سینے میں پیدا ہو گیا
صحبتیں بچھڑی ہوئی پھر ہائے یاد آنے لگیں

تا کجا تاریک جنگل میں یہ بزم آرائیاں
جوشؔ اب گھر چل، کہ گہری بدلیاں چھانے لگیں

جوشؔ ملیح آبادی



جو کی روٹی، مٹی کا پیالہ

(۱)

تاریخی واقعہ صرف اس قدر ہے کہ جب ایران سے شہنشاہ ہمایوں از سر نو قسمت آزمائی کے خیال سے روانہ ہونے کو تھے تو کسی غیر معمولی قلبی کشش سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو فرغانہ خط لکھا کہ آپ میرے ہمراہ ہندوستان چلیں۔ خانم جہاں اس خط کے پہنچتے ہی مع اپنی کمسن لڑکی کے ایران کی سرحد پر آپہنچی۔ تیموری آداب کا تقاضا یہ تھا کہ ہمایوں خود ہمشیرہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ ایرانی جاہ پرستوں کا مشورہ یہ تھا کہ خانم جہاں محل میں حاضر ہو کر دربار داری کریں مگر تیموری غیرت غالب آئی اور ہمایوں ایک سعادت مند چغتائی کی حیثیت سے خانم جہاں کے خیمہ میں حاضر ہوا۔ ترکی بھولی تو نہ تھی مگر ایران میں دس سال کی آرام طلبی نے کچھ کچھ ترکی طرزِ تکلم سے ناآشنا سا کر دیا تھا۔ خانم جہاں مسکرائی اور بھائی کی پیشانی پر خواہرانہ اظہارِ اُلفت کر کے بولی:۔

خانم جہاں۔ مرزا! زبان گئی تو گئی چغتائی تلوار نہ لڑکھڑائے!

ہمایوں۔ آکا۔ آپ ہمراہ ہونگی تو بجلی کی طرح چمکے گی۔ افغان کھوپری کو کدو کی طرح کاٹے گی۔

خانم جہاں۔ انشاء اللہ۔ مرزا! میرے پاس یہ مٹی کا پیالہ ہے، جو کی روٹی ہے۔ چنگیز۔ اور تیمور کے گھرانے کی لڑکیاں بھائی کی اس سے بڑھ کر خدمت نہیں کر سکتیں کہ سمرقند کا پانی سمرقند کی مٹی میں پیش کریں۔ پانی پیو، جو کی سوکھی روٹی کھاؤ اور یہاں سے کم از کم دس کوس پر جا کر دم لو۔ اگر ہندوستان فتح کرنا ہے تو رات کو دن کر دو۔

خانم جہاں کے الفاظ ہمایوں کی تیموری رگوں میں برقی اثر پیدا کر گئے۔ یا تو کچھ دن آرام کا خیال تھا یا فوراً حکم دیا:۔

"دم نہ لو۔ بڑھو۔ اُڑو"

یہ حکم ترکی میں تھا۔

(۲)

ہندوستان فتح ہو گیا۔ ہمایوں جمنا کے کنارے ہند کی گود میں جا لیٹا۔ خانم جہاں خواب و خیال ہو گئی۔ اس کی کمسن لڑکی جس کی شادی خالص چغتائی خاندان میں ہوئی تھی کافی عمر پا کر سمرقند کی مٹی میں مٹی ہو گئی۔

(۳)

شاہنشاہ جہانگیر ایک دن نورجہاں سے کچھ ناراض سے تھے۔ اس خفگی میں تیموری خون کا جو نصف حصہ باقی تھا وہ کچھ کھولا۔ دادا کی پھوپھی زاد بہن کا مٹی کا پیالہ جوکی روٹی یاد آئی۔ تُرکی ابھی بھولی نہ تھی۔ تُرکی میں مراسلہ لکھا اور حکم دیا کہ مع تحائف خانم جہاں کی نواسی کی خدمت میں سمرقند جاکر پیش کرو۔

مُراسلہ نہ تھا روحانی تڑپ کا مرقع تھا۔ یعنی جہانگیر کا رُواں رُواں دُہائی دے رہا تھا کہ "اے میرے آبائی وطن میری فریاد سُن۔ سیاہی زادہ ہوکر قفسِ عیش میں بند ہوں۔ مجھے رہا کردے۔ راحت پسند کو پھر شمشیر زن کردے۔ میں تجھ تک پہنچ نہیں سکتا تو مجھ تک کسی صُورت میں آجا۔ اسے کاش کہ کوئی تو میرا اپنا ہو"۔ گویا خط نہ تھا قلبی کشمکش کی بولتی ہوئی تصویر تھی اور کیوں نہ ہوتی؛ خون کو خون پکار رہا تھا۔

(۴)

خانم جہاں کی نواسی رشید جہاں خط دیکھ کر حیران ہوئی مگر تیموری فہم، تیموری عزم دونوں برقرار تھے۔ سمجھ گئی اور جہانگیر کے تحائف سمرقند میں تقسیم کرکے ایک گھوڑے پر آپ، دوسرے پر ایک چنگیزی جاں نثار سمرقند سے چل پڑی۔ لاہور عین اُس وقت پہنچی جب شاہنشاہ جہانگیر کشمیر کے سفر کی تیاری میں تھے۔ شاہنشاہ کو بھول بھی چکا تھا کہ کسی کو بلوایا ہے۔ نورجہاں سے جو عارضی ملال ہُوا تھا مدت سے مٹ چکا تھا۔ اطلاع ہوئی کہ رشید جہاں سمرقند سے آپہنچی۔ نورجہاں کو اشارہ کیا کہ ہماری آپا ہے تم جاکر لوا لاؤ۔ وزیر بولا:۔

وزیر۔ جہاں پناہ! جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

شاہنشاہ۔ ہاں۔ کیا ہے۔

وزیر۔ شاہزادی رشید جہاں کا پیغام ہے کہ تیموری آداب کے مطابق مرزا خود ہماری خدمت میں حاضر ہو۔

شاہنشاہ۔ وہ ٹھیک فرماتی ہیں۔ شاہنشاہ اگر ہیں ہوں تو ہندوستان کے لئے ہوں۔ اُن کے لئے تو واقعی صرف مرزا ہوں۔ کہلا بھیجو کہ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

ادا شناسِ ایران بھلا کب چوکتا تھا۔ بادشاہ سلامت کا رُجحان دیکھتے ہی نورجہاں نے اشارہ کیا۔ سونے چاندی کے ظروف، اطلس کمخواب کے تھان، اشرفیوں کی تھیلیاں۔ پالکیاں۔ فرش فروش، خیمے، غلام، لونڈیاں، خواجہ سرا۔ داروغہ۔ فوج کا دستہ رشید جہاں کے مختصر خیمہ کے سامنے آن کی آن میں موجود ہو گئے۔ ملکہ نورجہاں کی اس شاندار پیش کش نے شاہزادی رشید جہاں کے دل پر خاص اثر کیا، مگر ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ بادشاہ سلامت تشریف لائے۔

رشید جہاں ۔ مرزا! نانی مرحومہ کی وصیت تھی کہ وہ مٹی کا پیالہ جس میں ہمایوں نے پانی پیا محفوظ رہے۔ وہی لائی ہوں۔ لو سمرقند کا پانی پیو۔ سمرقند کے جَو کھاؤ اور دس کوس پر جا کر دم لو۔

جہانگیر ۔ زہے قسمت کہ دادا جان کے استعمال شدہ پیالہ میں سمرقند کا پانی نصیب ہو۔ لائیے۔

رشید جہاں ۔ بسم اللہ۔ مگر یہ نہ بھولیے کہ دس کوس پر دم لینا ہوگا۔

جہانگیر ۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پانی پیتے ہی پھر ترکی میں حکم ہوا:۔

"دم نہ لو۔ بڑھو۔ اُڑو"

(۵)

رشید جہاں نے چار مہینے درباداری میں کشمیر میں کاٹے۔ شاہنشاہی جشن شبانہ عیش جاودانہ سے خوگر نہ ہوئی۔ موقع پاتی تو اپنے چنگیزی جان نثار کو ہمراہ لے کر کشمیر کے کوہستانی علاقوں میں کبھی سوار کبھی پیادہ خنجر آزمائی کرتی رہتی۔ تیندوا۔ ریچھ، شیر جو مل جائے مُنہ نہ موڑتی۔ ایک شیر نے زخمی بھی کیا۔ مگر تیموری رگ و ریشہ زخم کی کیا پروا کرتا؛ بناہی زخموں سے اچھا ہونے کے لئے تھا۔ جہاں پناہ نے دو ایک دفعہ دبی زبان میں جرأت کی داد بھی دی مگر ڈرتے ڈرتے اس لئے کہ تیمور کی اولاد کے لئے مرد ہو یا عورت جرأت کوئی فخر نہ تھا۔ اشارۃً یہ بھی کہا کہ تنہا شیر کا مقابلہ ہو جائے تو مضائقہ بھی نہیں مگر ہر دفعہ نہیں۔ اس پر رشید جہاں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "کیا کروں کہ ان جنگلوں میں ہاتھی نہیں "۔

(۶)

دربار ابھی کشمیر ہی میں تھا کہ افواہ پھیلی کہ شاہزادی رشید جہاں شاید جلدی سمرقند واپس جانا چاہتی ہیں۔ افواہ پھیلانے والوں کا خیال یہ تھا کہ شاید ملکہ عالم ملکہ نورجہاں یہ خبر سُن کر خوش ہوں۔ بلکہ دراصل چند رموز شناس درباداروں نے سازش کر کے یہ افواہ پھیلائی تھی۔ یہ منصوبہ بازی دربار کے لئے معمولی شغل تھا۔ نورجہاں سُن کر مسکرائی، پھر ہنسی اور یہ کہہ کر کہ "خوب می شناسم" سیدھا جہاں پناہ کے حضور میں دست بستہ آکھڑی ہوئی۔ تخلیہ ہو گیا۔

نورجہاں ۔ جہاں پناہ خطا معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔

جہانگیر ۔ جانِ من! کیسی خطا کیسی معافی تم حکم کرو۔

نورجہاں ۔ جہاں پناہ یہ معاملہ حکم کا نہیں محض ایک التجا ہے۔

جہانگیر ۔ آخر کچھ کہو تو سمجھ میں آئے۔

نورجہاں۔ کیا جہاں پناہ کا خیال ہے کہ چغتائی شہزادی رشید جہاں سے مجھے کچھ کد ہے ؟

جہانگیر۔ ہرگز نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ سارے ہندوستان میں تم ایک اس کی سچی قدر دان ہو۔

نورجہاں۔ ظلِ الٰہی کا یہ ارشاد القار ربانی سے کم نہیں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ جہاں پناہ اُسے محلسرا میں داخل کریں میں آپ کی اور اُس کی کنیز بن کر رہوں گی۔

جہانگیر۔ تم بہت دانا ہو مگر اس معاملہ میں تم قطعی بے خبر ہو۔ آنجہانی دادا جان کی وصیت تھی کہ میری اولاد کو جب کوئی مصیبت ہو تو خانم جہاں کی اولاد سے مشورہ لیا جائے۔ خانم جہاں کی اولاد چغتائیوں کی محافظ ہے۔ ان کو بھی خانم جہاں کی پُشت در پُشت وصیت ہے کہ ظہیر الدین بابر کی اولاد کے کام آسکو تو دریغ نہ کرنا۔

نورجہاں۔ اس سے بہتر وہ کیا مدد کر سکتی ہیں کہ محل میں داخل ہوں۔

جہانگیر۔ اصل چغتائی کے لئے محل قید ہے مگر چونکہ تم اکا کی قدر دان ہو تم خود اُن سے مِل کر گفتگو کر لو۔ تمہارا اطمینان ہو جائے گا کہ میری رائے صحیح ہے۔

(۷)

نورجہاں جب اکا کے خیمہ کی طرف بے تکلف بلا اطلاع کرائے اور بلا کسی شاہانہ جاہ وحشم کے روانہ ہوئیں تو دربار انگشت بدنداں تھا کہ ملکۂ عالم اور اس سادگی سے ایک سمرقندی اجنبی کی طرف جا رہی ہیں۔ دونوں بیگمات ملیں۔ قہوہ اور میوہ پیش ہُوا۔ پھر تخلیہ۔

نورجہاں۔ اکا میں آپ کی خدمت میں ایک خاص التجا لے کر آئی تھی لیکن مجھے پہلے یہ کہنا ہے کہ گو میں بھی حسین ہوں مگر آپ کے قد کی رعنائی غضب ہے۔ اور آنکھوں والے تو تمہیں بے انتہا حسین تصور کرتے ہوں گے۔

رشید جہاں۔ بیگم خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ خدا نہ کرے کہ میں حسین ہوں۔

نورجہاں۔ ایں۔ یہ کیا کہا ؟

رشید جہاں۔ حسین ہو تو تم سا ہو ورنہ سادہ رو ہونا ہی اچھا ہے۔ اور قدرت کے کھیلوں میں یہ سب سے عجیب کھیل ہے کہ حسین عورت آج تک جب سے آسمان نے زمین کو ڈھانکا ہے کبھی اولاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہوتی۔ میں سمرقند واپس جانا چاہتی ہوں وہاں جس میرے دل کے سردار کو میرا انتظار ہے اس کے بے رونق خیمہ میں اس کے بہادر بچوں کو پالوں گی۔ بیس تیس پشت کے بعد پھر شاید ہم سے کوئی تیمور اور بابر پیدا ہو۔ فی الحال تو ہندوستان نے ہماری ایک شاخ کو چپٹ کر لیا ہے۔ بیگم تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو کہ میں تمہارے شاندار دربار کو کس نظر سے دیکھتی ہوں۔ بارہا تعجب

ہُوا تو یہی ہُوا کہ تیموری گھرانے کے دربار میں شاعر اور شُہدے بہت اور سپاہی اور سرفروش کم۔ حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ جس مرد کو دیکھو کمر میں تلوار ندارد مگر گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ جہاں مرد زیور پہنتے ہیں وہاں عورتیں تو ضرور ننگی رہتی ہوں گی۔ کیا ان عیش کے پُتلوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ مرد کا زیور زخم ہیں نہ کہ موتی۔ بیسیوں دفعہ دربار میں غور سے دیکھا۔ اُمرا نے تحائف میں سونے اور موتیوں کے ڈھیر پیش کئے مگر ان نکموں میں سے سوائے چند راجپوت امرا کے کبھی کسی نے مرزا کو مفتوح دشمنوں کی تلواریں اور ڈھالیں نذر نہ کیں۔ آخر یہ سب کے سب نام کے مرد روز و شب، ماہ و سال دربار میں کرتے کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو فتح کے بعد جشن ہوتے ہیں۔ کامیاب شکار کے بعد جام چلتا ہے اور یہاں روز جشن اور صبح و شام دمبدم کے جام۔ میں تو ہندوستان کی فضولیات سے اُکتا گئی۔ اتنا البتہ ضرور کہوں گی کہ چغتائیوں کا اگر کوئی سچا رفیق ہے تو چند بڑے گھرانوں کے راجپوت۔ وہی لوگ کچھ تلوار کے دھنی بھی ہیں۔ شاید جَو کی روٹی کھاتے ہوں گے!

نورجہاں۔ آکا آپ ٹھیک فرماتی ہیں اس ملک کے مسلمانوں میں بے انتہا آرام طلبی ہے۔ خود تو ایران دیکھا نہیں مگر سُنتی ہوں کہ وہاں سے بھی یہاں کہیں زیادہ عیش پرستی ہے۔ یہاں تاتاری جرأت کی، تیموری تُرکتازی کی تلاش عبث ہے۔

رشید جہاں۔ بیگم مجھے انتظار تھا کہ کبھی آپ بے تکلف تشریف لائیں تو آپ سے درخواست کروں کہ آپ میرے ناچیز تحفہ کو قبول فرمائیں۔ یہ لیجئے ایک سادہ دست بند۔ آپ کے لئے سمرقند سے لائی تھی۔ (نورجہاں بیگم اس دست بند کو آنکھوں سے لگاتی ہے) یہ ہے بھی اس قابل۔ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا۔ حق بحقدار رسید۔

نورجہاں۔ میں آپ کی دریا دلی دیکھ کر تعجب کرتی ہوں۔ جہاں پناہ نے آپ کو تحائف دیئے وہ آپ نے سب بانٹ دیئے اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔

رشید جہاں۔ سنو بیگم۔ تیمور کی اولاد دنیا میں اپنے آپ کو لٹوانے آتی ہے۔ جب ہم میں سے کوئی حساب کر کر کے جمع کرنے والا پیدا ہوگا تو یقیناً تیموری عزم مٹ جائے گا۔ ہم لوگوں کی سب سے بڑی دولت ہمارا خالص خُون ہے۔ ہم اس کے بہانے اور لٹوانے میں دریغ نہیں کرتے تو اور کسی چیز کو کیا رکھیں گے؟

نورجہاں۔ خدا کے لئے آپ مجھے اپنا سچا قدر دان سمجھیں اور کوئی ارشاد کریں جو میں پورا کر سکوں۔

رشید جہاں۔ مرزا سے مجھے سمرقند واپس جانے کی اجازت لے دیجئے۔ میں نانی مرحومہ کی وصیت کی پابندی میں چلی آئی۔ جَو اور پانی لائی تھی۔ وہ دے چلی۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خانم جہاں کی اولاد کے ذمہ آئندہ اب شاید ہی کوئی خدمت ان ہندی مرزاؤں کی طرف سے تفویض ہو۔

U 960

(۸)

جہانگیر ۔ کہو جانِ من! تم کچھ متفکر سی ہو! خیر تو ہے؟

نورجہاں ۔ جہاں پناہ! دیکھئے یہ دست بند مجھے آکا نے دیا۔ فرماتی تھیں کہ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا اور مجھے رشید جہاں نے یہ کہہ کر دیا "حق بحقدار رسید"۔

جہانگیر ۔ اور کیا باتیں ہوئیں؟

نورجہاں ۔ جہاں پناہ وہ بات تو میں زبان پر بھی نہ لا سکی۔ رشید جہاں کو ہمارے دربار سے اپنے جنگلی خیمہ وخرگاہ زیادہ مرغوب ہیں۔ کس قدر اس چغتائی شہزادی کو اپنے صحیح النسب چغتائی ہونے پر فخر ہے میں تو اُس کے سامنے جھینپ گئی۔

جہانگیر ۔ وہ سچ ہے مگر ہند کا بھی ہم پر حق ہے۔ محمود غزنوی یہاں کی دولت لے گیا مگر اپنا ایاز یہاں چھوڑ گیا۔ موت کے اس ایک حملہ نے محمود کے سترہ حملوں کا کافی جواب دے دیا۔ ہم لوگ اب یہاں کے ہو چکے۔ سمرقند کا پانی یہاں خون بن کر بہا۔ تب جاکر یہ سلطنت نصیب ہوئی مگر یہ بھی چند پُشت کی بات ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔ قبلہ مرحوم کا شاعر کہہ گیا ہے ؎

جام مے در دست گیر و پا بہ گلشن نہ کہ باز
بادست افشاں در آمد آب پا کوباں رسید

لاؤ تم مجھے ایک جامِ مے دو۔ پہلو میں بیٹھو اور سمرقند کو بھول جاؤ۔

جہاں پناہ جب ایک آدھ جام پی کر افکارِ سلطنت سے اِک گونہ آزاد ہوئے تو نہایت لطف سے اپنی محبوبۂ دلنواز سے فرمانے لگے۔

جہانگیر ۔ کہو جانِ من میں اس تمہارے کھیل کو کہ تم مجھے مشورہ دو کہ رشید جہاں کو محلسرا میں لاؤں کیا سمجھوں؟ کیا تم میری وفا کا امتحان لے رہی تھیں یا کچھ اور مدِ نظر تھا؟

نورجہاں ۔ جہاں پناہ۔ عورت یعنی کوئی معمولی عورت کبھی اپنے شوہر سے اس قسم کی التجا نہ کرتی۔ مگر میں معمولی عورت نہیں۔ میں ملکہ ہوں اور آپ کے دل کی ملکہ ہوں مگر اس سے بھی بڑھ کر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ کی جان نثار ہوں۔ آپ میرے ہیں میں آپ کی ہوں مگر سلطنت چغتائی ہے اور میں باوجود ایرانی ہونے کے دل سے چاہتی ہوں کہ چغتائی باغ ہرا بھرا رہے۔ آپ کی سلطنت کے استحکام کے لئے میری خوشی، میری شان، میری آرزوئیں سب قربان ہو جائیں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ جو تجویز پیش کی تھی وہ محض اس نیت سے تھی ورنہ کون عورت ہے جو تاج وتخت میں کسی دوسرے کو شریک ہوتے دیکھ سکے۔ اگر اس شاہزادی کو آپ محل میں داخل کر لیتے تو ممکن تھا کہ سمرقند وبخارا سے بنگالہ اور لنکا تک صرف آپ

کا سکہ چلتا۔

جہانگیر۔ خدا جانے تم باور کرو یا نہ کرو مگر جو بادشاہ ہوتے ہیں چاہے وہ مجھ جیسے گناہگار ہی کیوں نہ ہوں کسی حد تک غیب دان ہوتے ہیں۔ مجھے ایک صدی کے بعد چغتائی چراغ گل ہوتا نظر آتا ہے۔

نور جہاں۔ قربانت شوم ایسی بات زبان سے نہ نکالئے۔

جہانگیر۔ اب تو نکل گئی۔ لاؤ ایک پیالہ اور۔

نور جہاں۔ میری سنیں تو میں تو یہی کہوں کہ شیرازی انگور سے سمرقند کے جَو اچھے۔

(۹)

کہتے ہیں کہ شاہنشاہ فرخ سیر نے پنجاب کی ایک کٹھن مہم کے وقت ترکی میں خط لکھوا کر سمرقند قاصد روانہ کیا تو قاصد یہ جواب لایا۔

"مرزا!

وہ جَو سوکھ گئے۔ وہ پانی بہہ گیا۔ وہ پیالہ ٹوٹ گیا"

عبدالعزیز

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے

ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

نہ کھچنے والی تصویر

(۱)

اے کاش ترے باجے پر
رکھا ہو ترا البم
وہ، جس میں کہ چاہنے والے،
کانپتے ہاتھوں سے
لکھ دیتے ہیں افسانے
بیتاب دلوں کے
بے طور مچلنے کے

(۲)

تو راگ کی دُھن میں
سُن پائے نہ آہٹ
اُس میرے سکوں کی
جو دیکھ کے تجھ کو
آلیتا ہے مجھ کو
ایسے، کہ مرے پاؤں
گو لاکھ جتن کر لوں
بڑھنا تو بھلا کیا
ہل بھی نہیں سکتے

(۳)

بُت بن کے،
میں
بُت کے پیچھے
کچھ دیر تو ٹھیروں، پھر
پُرشوق نگاہیں
لپٹیں ترے البم سے
اور سحرِ تخیّل سے
لکھ ڈالیں یہ سطریں

(۴)

اک عکس ہے دل میں،
پیارا بھی ہے بھولا بھی

اور حد سے زیادہ ضدی :
آتا ہے، چلا آتا ہے
بنتا ہے، بگڑتا ہے
ٹالے سے نہیں ٹلتا ہے
پر شان ہے اس میں
حسن کی رعنائی کی۔

(۵)

اس عکسِ دلآرا کے
روزانہ کے پھیروں کا
راز میں کیونکر کھولوں
کوئی بلائے تو میں بولوں
فی الحال تو قصہ یہ ہے
اک عکس ہے
لاکھ اس کی جھلک ہے
تصویروں کا یہ تختِ رواں
مرکز ہے مری قسمت کا

(۶)

تنہائی کی تاریکی سے
ڈھانکے ہوئے رکھتا ہوں
اس عکسِ منور کو
گویا کہ یہ کعبہ ہے
کالا ہے غلاف اس کا

(۷)

میں یونہی اگر
پاس کبھی اس کے
جس کا یہ کرشمہ ہے
مجلس میں کسی گھڑی
آنکلوں کہ گزر جاؤں
ہرگز نہیں وہ تکتی
کون آیا؛ گیا کیسے؛

(۸)

پہلو میں بھی اس کے
بیٹھا ہوں کئی بار
دھک دھک سے مگر دل کی
ہو کر کے میں ناچار
اُٹھ بیٹھا ہوں پر اس نے

ہرگز نہیں پوچھا
جاتے ہو کہاں؟ بیٹھو

(۹)

ہوتا ہی نہیں اس کو
بھولے سے بھی ہرگز
اتنا سا گماں بھی
چھو جائے تلطف سے
گر ہاتھ مجھے اس کا
اس سادہ سے منتر سے
پھر جائیں مرے دن

(۱۰)

سحرِ تخیل سے
یہ نقش بندھے جب
اس شوخ کے البم پر
اور تو کھینچ کے اس کو
پڑھ ڈالے یہ سطریں
اور پھر پھینک کے اس کو
حیران سی ہو کر
ہلکے سے سروں میں
بیساختہ یوں گائے
یہ کس لڑکی کا قصّہ ہے؟
نہیں سمجھی ہیں کچھ بھی
بہت انجان ہو گی
نہ سمجھی ہو گی کچھ بھی

(۱۱)

گاتے ہوئے یونہی
مڑ کر مجھے دیکھے
اور بھولی سی ادا سے
ہنستے ہوئے کہہ دے۔
"تم آئے کب سے؟ بیٹھو"۔
"سمجھ کر بھی
نہیں سمجھی میں کچھ بھی"۔

فلک پیما
۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ء

ترجمۂ رباعیات عمر خیام

حکیم عمر خیام

غم چند خوری بکار نا آمد و پیش | رنج ست نصیب مردمِ دُور اندیش
خوش باش و جہاں تنگ مکن بر دلِ خویش | کز خوردنِ غم قضا نہ گردد کم و بیش

ترجمہ

ناداں! غمِ انجام سے کیوں ہے دل ریش | ہے رنج نصیبِ مردمِ دُور اندیش
خوش رہ کہ کسی کے رنج و غم کھانے سے | احکامِ قضا ہو نہیں سکتے کم و بیش

ترجمۂ دیگر

تقدیر کا حُکم ٹل سکے ، ناممکن | تدبیر کا زور چل سکے ، ناممکن
ناداں! غمِ این و آں سے کچھ حاصل بھی؟ | قانونِ قضا بدل سکے ، ناممکن

حکیم عمر خیام

گویند کہ مرد را ہنر می باید | یا نسبتِ عالیٔ پدر می باید
امروز چناں شدہ ست در نوبتِ ما | اینہا ہمہ ہیچ ہست، زر می باید

ترجمہ

گو قول ہے ، مرد کچھ ہُنر رکھتا ہو | یا نسبتِ عالیٔ پدر رکھتا ہو
لیکن عملِ اہلِ جہاں کہتا ہے | یہ سب ہے فضول، صرف زر رکھتا ہو

حکیم آزاد انصاری

غزل

وہ عربدہ جُو، معصوم ادا، قاتل بھی ہے اور قاتل بھی نہیں
دِل اُس کی سادہ اداؤں کا، بسمل بھی ہے اور بسمل بھی نہیں

وعدے پہ نہیں آتا سچ ہے، پر یاد تو اُس کی آتی ہے
اُس جانِ محبت کا وعدہ، باطِل بھی ہے اور باطل بھی نہیں

دیکھو تو ہر اِک سے بیگانہ، سمجھو تو کسی کا دیوانہ
دِل یار کی بزمِ عشرت میں، شامِل بھی ہے اور شامِل بھی نہیں

ظاہر میں ہر اِک شئے پر قبضہ، باطن میں نہ ذرّہ بھی بس کا
دُنیا میں ہماری ہستی کا حاصِل بھی ہے اور حاصِل بھی نہیں

ہر دِل ہے نشیمن کاشانہ، اس پر بھی تباہ و ویرانہ
اُس جانِ جہاں کے جلووں کی منزل بھی ہے اور منزل بھی نہیں

دیوانہ مگر اہلِ عرفاں، تاریک مگر مہرِ تاباں
دل تیری نگاہِ اُلفت کے قابل بھی ہے اور قابل بھی نہیں

ایقان تذبذب کا زخمی، عرفاں کی شعاعیں دُھندلی سی
دُنیا تری روشن ہستی کی قائل بھی ہے اور قائل بھی نہیں

ہے جذبۂ کامل کے دم تک، نظارہ کی یہ فردوس گری
اے قیس! بگولا صحرا کا محمل بھی ہے اور محمل بھی نہیں

عرفانِ خودی ہے عینِ بقا، احساسِ خودی پیغامِ قضا
ہستی مری راہِ اُلفت میں حائل بھی ہے اور حائل بھی نہیں

جو ڈوب گیا وہ پار اُترا، جو سطح پہ تھا وہ تر نہ سکا
دریائے محبت کا ماہر ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

ماہر القادری

رُباعیات

۱

اے قطرۂ آب، پھیل، دریا ہو جا
اے طائرِ روح، مرغِ سدرہ ہو جا
اس خانہ خراب قصرِ تن کو ڈھا دے
اے تودۂ خاک، اٹھ، بگولا ہو جا

۲

یہ چہرۂ خورشید سیاہی تا چند
سلطانِ حقیقت یہ تباہی تا چند
جانم بہ ہمہ تن [illegible] تنگ اے اللہ
ایں مردہ بدو [illegible] من آہی تا چند

۳

اسباب و علل کا دور آنے سے پہلے
[illegible] فطرت یہ جو [illegible] سے پہلے
جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا [illegible]
اب کیوں ہو ہوا [illegible] سے پہلے

۴

تقدیر سے کیا گلا، خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا، ہوا، خدا کی مرضی
[illegible] کیوں ہیں
[illegible] سے انتہا، خدا کی مرضی

امجد

بے فکر امجد!

امجد ایک بے فکر، خوش لباس اور باتمیز نوجوان تھا جس کی زندگی کے اصول تین تھے۔ اچھے کپڑے، شائستگی اور افکار و آلام سے آزادگی۔ اچھے کپڑے پہننا اس کے نزدیک متمدن ہونے کی ظاہری علامت تھی اور شائستہ ہونا اس کا عملی پہلو تھا۔ اور یونہی کسی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھتے رہنا اور جو معاملہ حتی الوسع انسان نہ حل کر سکے، جو اس کے احاطۂ تدبیر سے باہر ہو، یا جس پر اس کا اختیار نہ ہو، یا جس کو سلجھانے کی اس میں قدرت نہ ہو، یا جو باوجود اس کی کوششوں کے ٹھیک نہ ہو سکے، اس پر بے سود تاسف یا ملال یا رنج یا فکر محسوس کرنا، وہ ایک عقلمند اور بالغ نظر آدمی کے لئے جسے اپنے دماغ کے توازن اور دل کے چین کی تمنا ہو، مضر ہی نہیں بلکہ واہیات اور لغو خیال کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر ایک کو یہی تلقین کیا کرتا تھا کہ اول تو آدمی خوشی کو اپنا مطمح نظر بنائے اور اگر ہر وقت آدمی ہنس نہیں سکتا تو کم از کم ملول و محزون تو نہ رہے۔ عام طور پر ان خیالات کو وہ اپنے دوستوں یا بھائی بہنوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔

لباس کے معاملے میں اس کا رکھ رکھاؤ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ اکثر جان پہچان والے کپڑوں کے معاملے میں اسے بطور سند پیش کرنے لگے مگر اس میں امجد کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ لوگ یا دوست یا گھر والے ہی اس کے کہنے کے مطابق کپڑے پہنیں یا بنوائیں۔ کیونکہ اس کا نظریہ تو یہ تھا کہ ہر آدمی کی شخصیت کا کم و بیش اس کے لباس سے پتہ چل جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنی شخصیت کا اظہار اپنے لباس کے ذریعہ سے کرے اور یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جب ہم کسی دوست کی رائے یا پسند یا مشورہ کے مطابق کپڑے بنوائیں یا پہنیں۔ اسے خود اس بات پر اتنا اعتقاد تھا کہ جب کسی کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا تو وہ اس کے لباس کو کبھی نظرانداز نہ کرتا علیٰ ہذا القیاس شائستگی کے متعلق۔ اس سے اس کی مراد اخلاق نہیں تھے۔ وہ شائستگی کو خوش اخلاقی کا خارجی پہلو سمجھا کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ تہذیب کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ خواہ ہم باطن میں کچھ ہوں، ظاہری طور پر ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام آداب کو ملحوظ رکھیں اور جہاں تک ہو سکے تمیز اور آداب اور شائستگی کو ایک اہم اور لازمی اور بنیادی اصولِ زندگی تصور کریں۔ بہرحال یہ چیزیں اس کی دماغی ساخت کا ایک مظہر تھیں۔

لباس کے متعلق اس کی گفتگو اس کے گھر والوں کے لئے اچھا خاصا مذاق تھی۔ اس کے بھائی اور بہنیں، اس کی والدہ اور بعض دفعہ اس کے والد بھی اس تفریح میں شامل ہو جایا کرتے تھے اور بارہا ایسا ہوتا کہ امجد بیچارہ ان کی باتوں کو نہایت سنجیدگی سے قبول کر لیتا اور اسے خیال تک نہ ہوتا کہ اس سے مذاق ہو رہا ہے مثلاً یوں ہوتا کہ کوئی کپڑا بیچنے والا ڈیوڑھی میں بیٹھا اپنے لڑکے کے

ہاتھ اندر بھان پر تھان بھیج رہا ہے کہ شوخ رشیدہ اُٹھتی اور ایک دو تھان بازو پر ڈال اندر اس کے کمرے میں جا دھمکتی کہ امجد یہ کپڑا مجھے سجیگا یا یہ؟ اسے "آنکھ کا نشہ" کہتے ہیں اور اسے "دل کی پیاس"۔ کبھی تو وہ یہ سمجھ کر کہ یہ مشورہ محض از راہِ تفنن ہے ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی وہ اس موضوع پر لکچر ہی دینے لگ جاتا کہ لڑکیوں کو کپڑے پہننے کی تمیز ہی نہیں۔ چاہئے تو یہ کہ جیسے رسم و رواج نے انہیں دوپٹہ اور قمیص اور شلوار تین چیزیں دی ہیں ان ہیں ایسے جوڑ اور تناسب پیدا کئے جائیں جو واقعی دلچسپ اور دلفریب ہوں مگر رواج ہے تو سولوں کا کہ ایک کپڑے کی قمیص اور اسی کپڑے کی شلوار۔ معلوم نہیں دوپٹہ بھی اسی کپڑے کا کیوں نہیں پہن لیتیں۔ غرض یہ کہ عام طور پر جس دن کپڑا خریدنا ہوتا اس دن کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہو جاتا۔

چونکہ امجد کا اصرار تمیز اور لباس پر کئی دفعہ باقی لوگوں کے لئے دو بھر ہو جاتا اس لئے یہ بھی ہوتا تھا کہ محض اسے چڑانے کی خاطر کوئی نہ کوئی شخص اگر بدتمیزی نہیں تو خوش طبعی کی خاطر ایسی حرکات کر دیتا کہ امجد نفرت سے پھنکارتا ہوا اُٹھ جاتا اور اپنے کمرے میں جا بیٹھتا۔ یا اگر مذاق کرنے والا اس سے عمر میں چھوٹا ہوتا تو اس کی باتوں باتوں میں وہ مرمت کرتا کہ سب ہنس پڑتے یا کم از کم مسکرانے لگتے یا اُٹھ کے کہیں اور کسی کمرے میں چلے جاتے اور وہاں جا کے ہنس لیتے۔ ایک اور بات جس پر امجد کا مذاق اُڑا کرتا تھا اس کا تایا جان کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کے والد کے بڑے بھائی اسی شہر میں تاجری کرتے تھے، ہزاروں کا کاروبار تھا۔ سو چیزوں میں ان کے ہاتھ تھے کہیں کسی کو مشین کا آرا لگوا کے دے رکھا ہے اور کہیں ساتھ ہی چکی لگ رہی ہے، گرمیوں میں کسی برف کے کارخانے میں حصہ داری کیا کرتے تھے، سردیوں میں کمبل، لوئیاں اور دُھسے باہر سے منگوا کے ان کا بیوپار کر لیا کرتے تھے غرض سو کام انہوں نے شروع کر رکھے تھے۔ ان میں دو ایک اُن کے لڑکے بھی شامل تھے، جنہیں بی اے پاس کر کے تجارت میں ہی لگا دیا تھا۔ لڑکیوں کے بہت خلاف تھے، بلکہ نئی وضع ہی کے دشمن تھے۔ فارغ البالی تھی اس لئے لڑکیوں کو گھر ہی پر تعلیم دلوائی تھی مگر سکول بھیجنا گوارا نہیں کیا۔ اُن کو انگریزی پڑھانے کے بہت خلاف تھے اگرچہ انہوں نے خفیہ خفیہ اپنے بھائیوں سے کچھ نہ کچھ استعداد پیدا کر ہی لی تھی۔ ان میں سے بڑی کی عمر اُنیس سال کی تھی اور اس کا نام تسنیم تھا۔ گورا رنگ تھا اور میانہ قد۔ لمبی لمبی خمدار سیاہ پلکیں اور چمکدار بھوری آنکھیں، اور صاف اور فراخ اور روشن پیشانی، اس کے چہرے کو دلکش بنانے کے لئے کافی تھیں اور قدرت نے اسے دو ایسے ہونٹ دیئے تھے جن کی ہلکی سے ہلکی جنبش میں کچھ نہ کچھ معنی پنہاں ہوتے تھے اور جو اکثر ایک طرف کو نامعلوم طور پر جھکے رہتے تھے گویا وہ ابھی ابھی کوئی پُرلطف لطیفہ سُن چکی ہے اور اس سے حظ اُٹھا رہی ہے چنانچہ امجد کا آنا جانا اپنے تایا کے گھر عام تھا۔

اس لئے جب بھی امجد شام کے قریب خوش قطع اور خوش وضع کپڑے پہن کر باہر جاتا تو کسی نہ کسی چہرہ پر مسکراہٹ ضرور آ جاتی۔ اور کوئی نہ کوئی اونچی آواز سے نہیں تو ہلکے سے ضرور کہہ دیتا "ارے بانکے میاں تم کہاں چلے" یہ اس لئے بھی کہ دو بہنیں اس سے بڑی تھیں اور ایک بھائی۔ اگرچہ بھائی ملازم تھے مگر کبھی نہ کبھی وہ بھی گھر پر ہوتے ہی۔ سب ملا کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ایک بھائی اور

ایک بہن امجد سے چھوٹی تھی۔ بڑی بہنوں میں ایک بیاہی ہوئی تھی۔ مگر چونکہ اس کا خاوند بھی اپنے ہی شہر کی میونسپل کمیٹی کا سکتر تھا وہ دونوں اور ان کا ننھا بچہ اسی بڑے مکان کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ دوسری بہن کی فقط منگنی ہوئی تھی۔ گویا امجد کی حرکات وسکنات میں دلچسپی لینے والے گھر میں کئی شخص تھے۔ اس لئے یہ آواز اکثر اسی سے مخاطب ہُوا کرتی۔ جواب ہمیشہ یہی ہوتا "یُونہی باہر جارہا ہوں، سیر کا ارادہ ہے"۔ سب جانتے تھے کہ ہفتہ میں کم ازکم تین مرتبہ یہ سیر اسے کہاں لے جاتی ہے۔ شاید امجد کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس لئے کئی دفعہ جب ان کی مسکراہٹ اور استہزا کو پہچان لیتا تو کچھ جھینپ ضرور جاتا۔ اور شاید اس شام کو شرم کے مارے اپنے تایا کے ہاں نہ جاتا۔

مگر خم دار سیاہ پلکیں جب چمکدار بھوری آنکھوں پر جھکی رہیں تو ان سے بہت دُور رہنا مشکل سا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے آنے سے ہونٹوں پر ایک تازگی اور ان کے ایک کونے میں مسکراہٹ جھانکنے لگے اور جب کسی مشکل لفظ یا شعر کے معنی نہ آتے ہوں اور بھائی امجد سے سمجھنے پڑ جائیں، یا کام کچھ ہو مگر ایک آدھ نگاہ ہر منٹ میں آڑی، ترچھی یا سیدھی کسی تک پہنچ جائے تو اس مقام پر موجود نہ ہونا اگر تکلیف دہ نہیں تو مروّت اور اخلاق کے منافی ضرور ہے۔ اور مروّت جب انسان کا جوہر ہو تو پھر ایسی بدخلقی اور بے اعتنائی گناہِ کبیرہ نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگرچہ گھر کی مالکہ خاص گرمجوش واقع نہ ہوئی ہو پھر بھی جب گھر اپنے تایا کا ہو تو نہ جانا محض کمزوری نہیں تو اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ اگر تائی صاحبہ کی نظر ایک سیکنڈ سبزی یا کپڑے یا جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہو، اس پر ہو اور دوسری نظر کسی کی برق پاش نگاہوں کو راستہ ہی میں روک لینے کی خواہشمند ہو، تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ کہیں بجلیاں بھی روکنے سے رُکی ہیں؛ یہ بھی مان لیا کہ اُس جگہ کبھی کبھی تایا زادبھائی کو سوال ہی سمجھانا پڑجاتا ہے یا کبھی کوئی "جواب مضمون" ہی دیکھنا پڑجاتا ہے، مگر یہ بھی تو ہوجاتا ہے کہ کوئی بہن یہ بھی پوچھ لیتی ہے، "کیوں آپا بھائی امجد چائے پئیں گے نا!" اور پھر جب بھائی امجد کی پیالی کوئی خود ہی بناتا ہوا اور خود ہی اُٹھ کے اور قریب آ کے اور ہاتھ بڑھا کے اِک خاص نیم ادا اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ پیش کرتا ہو تو بیچارہ امجد کسی اور جگہ کیسے سیر کرتا پھرے۔ مگر گھروالے ان باتوں کو کیا جانتے!

کسی دن جب امجد کا اتفاقیہ گزر ادھر ہوجاتا، تایا جان بھی گھر پر ہی ہوتے۔ وہ امجد کے بہت مداح تھے۔ کہا کرتے تھے کہ خاندان کے سب لڑکوں میں امجد سب سے باتمیز اور مؤدب ہے۔ اور پھر امجد کی پوشش تو تعریف سے مستغنی تھی۔ اس بات کو تو غیر لوگ بھی مانتے تھے کہ لباس سجتا ہے تو میاں امجد کے بدن پر۔ اس لئے امجد جب بھی اپنے تایا جان کی موجودگی میں آجاتا تو وہ اس کی خوب آؤبھگت کرتے۔ شاید اس لئے بھی کہ ان کے چھوٹے صاحبزادوں کو جن میں سے ایک انٹرنس اور ایک ایف۔ اے میں پڑھتا تھا، کچھ نہ کچھ ایک مضمون میں نہیں، تو دوسرے مضمون میں بھائی امجد سے مدد لے لینے کو وہ بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ بہت پُرشفقت لہجہ میں کہا کرتے تھے، "بیٹا تمہارا بھائی آیا ہے، اس سے اپنی مشکلات حل کرالو۔ ماشاءاللہ لائق ہے۔

ایم اے میں پڑھتا ہے۔ اس جیسا لائق تو سارے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔ اسے تو ڈپٹی کمشنر ہونا چاہئے۔ بیٹا امجد تم اس ریاض کی انگریزی تو دیکھو کیسی ہے۔ مجھے تو یہ کبھی پڑھتا دکھائی نہیں دیتا۔ ایف اے میں ہے۔ اسے کوئی سوال تو پوچھو ہم بھی تو دیکھیں کیا جواب دیتا ہے۔" یہ علیحدہ بات تھی کہ تایا جان خود انگریزی نہیں جانتے تھے مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ ریاض کی لیاقت کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے اور پھر امجد پر ان کی خاص نظرِ نوازش تھی۔ یہ کام تو ازرہِ عنایت اس سے کرایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شب برات کے موقع پر امجد اور اس کے چھوٹے بھائی انور کی دعوت تایا جان کے ہاں تھی۔ اس میں امجد کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اگرچہ گھر میں انور کو ہر شخص مبارک باد دیتا تھا کہ بھائی تیری قسمت بھی جاگ اٹھی ہے۔ بہرحال وہ دونوں گئے۔ وہاں جس وقت پہنچے تو اتفاق سے صحن میں کوئی نہ تھا، وہ ادھر ادھر دیکھنے جس کمرے میں پہلے جا کھڑے ہوئے وہ تسنیم اور اس کی چھوٹی بہن نسیمہ کا تھا۔ تسنیم اس وقت اپنے بال بنا رہی تھی۔ امجد تو سلام کر کے اور ایک نظر دیکھ کر باہر نکل آیا مگر انور نسیمہ کا ہم عمر تھا۔ وہ دونوں چھٹپنے میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ اس لئے وہ نہایت بے تکلفی سے کچھ عرصہ وہیں رہا۔ گھر واپس آنے پر انور نے آپا رشیدہ سے کہہ دیا کہ جب بھائی امجد آپا تسنیم کے کمرہ سے نکل گئے تو نسیمہ نے آہستہ سے آپا تسنیم سے کہا تھا "لو آپا تمہارے بھائی امجد تو آ گئے"۔ اس 'تمہارے' کے لفظ کا بہت دن چرچا رہا۔ دو ایک دن بعد چھوٹی آپا نے بر سبیلِ تذکرہ امجد سے پوچھا کہ بھئی تمہاری تسنیم کا کیا حال ہے؟ اس پر امجد نے کچھ گھبراہٹ، کچھ شرم، کچھ غصے سے کہا، "'تمہاری' سے آپ کی کیا مراد ہے؟" جواب میں چاہئے تھا کہ چھوٹی آپا سنجیدگی اور متانت سے امجد کو سمجھاتیں، مگر انہوں نے کچھ ذومعنی اور چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ بھئی میرا اس میں کوئی قصور نہیں، یہ انور ہی کہتا پھرتا ہے، ہم تو تم جانتے ہی ہو، تمہاری باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ یہ بات امجد کے لئے اور بھی غصہ دلانے والی تھی۔ آپ اسی وقت انور کی طرف گئے کہ جا کے پوچھتا ہوں کہ وہ خبیث کیا بکواس کرتا پھرتا ہے۔ چھوٹی آپا نے بڑی آپا کی طرف دیکھا اور جب امجد وہاں سے دُور ہٹا تو دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

امجد نے انور کی خوب گت بنائی کہ تُو بہت شیطان ہے اور جو جی میں آئے بکتا رہتا ہے۔ نہ عقل ہے نہ تمیز۔ گھر میں ہر ایک سے میری باتیں کرتا رہتا ہے۔ آپا بڑی ہیں اور انہیں تو بھونڈے مذاق کرنے کی عادت ہے مگر تو کیوں انہیں ایسی بیہودہ باتیں سکھاتا رہتا ہے۔ انور بیچارہ کہتا رہا کہ میں نے انہیں کچھ نہیں سکھایا۔ وہ تو خود ہی آپ کے آنے جانے میں دلچسپی لیتی رہتی ہیں اور پھر بات کیا ہے بات تو بتائیے۔ امجد نے بات تو کچھ نہ بتائی۔ البتہ دیر تک انور کی شرارت اور بدتمیزی اور خباثت کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ انور نے بارہا پوچھنے کی کوشش کی کہ اس غصے کا راز کیا ہے مگر امجد نے اس امر کے متعلق

کچھ کہنا پسند نہ کیا مگر یہ تنبیہ اس کو کر دی کہ اگر تجھ میں ایک رتی برابر بھی شرافت موجود ہے تو میری بابت کوئی بات ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔ اب مان لیا کہ انور بھائی امجد سے دو درجے چھوٹا تھا مگر پھر بھی انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اس کو یہ ڈانٹ پسند نہ آئی۔ وہ شکایتہً چھوٹی آپا کے پاس پہنچا اور بہت خفا ہو کر ان سے کہا کہ آپا مجھے آپ کے مذاق اچھے نہیں لگتے۔ بھائی امجد سے کہتی کچھ آپ ہیں اور ان کا بس آپ پر تو نہیں چلتا، مجھ پر آ کے غصہ نکالتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بات آپ کریں اور پکڑوا مجھے دیں۔ چھوٹی آپا نے کہا "تم تو یونہی ناراض ہوتے ہو۔ امجد کی تو عادت ہی ہے اور پھر میں نے اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ فقط یہ پوچھا تھا کہ تمہاری تسنیم کا کیا حال ہے۔ اس میں غصے کی کیا بات ہے اور پھر تم نے خود ہی تو ہم سے کہا کہ نسیمہ نے اسی طرح تسنیم سے کہا تھا۔ یا تو تم نے بات اپنے دل سے بنائی ہے یا پھر امجد کو اتنا غصہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ انور کو اس پر اور بھی غصہ آیا کہ یا تو میں آئندہ آپ کو کوئی بات نہیں بتاؤں گا یا آپ مجھے پکڑوا نہ دیا کریں۔ اور مجھے دل سے گھڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ مجھے پتا نہیں وہ اسے چھیڑ رہی تھی کہ کوئی اور بات تھی مگر مجھے آپ پر بہت رنج ہے۔ وہ روز وہاں جائیں گے اور آپ انہیں بنائیں گی، وہ میرے پیچھے دوڑیں گے۔ میری جان تو عذاب میں پڑ جائے گی۔ مگر چھوٹی آپا نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ہنسنے لگے۔ اور انور نے انہیں امجد اور تسنیم کی اور باتیں بھی بتائیں کہ میں نے دیکھا کہ چائے کے وقت اور تو اپنی اپنی پیالی آپ اُٹھائیں مگر بھائی امجد کو آپا تسنیم خود اُٹھا کے دیں اور بھائی امجد تو وہاں جاتے ہیں تو کسی اور چیز کو دیکھتے ہی نہیں۔ باتیں ان سے کریں یا نہ کریں مگر جب کبھی میں ان کی طرف دیکھتا، ان کی نگاہیں اکثر آپا تسنیم کے چہرہ پر ہی ہوتیں۔ رشیدہ نے بڑی آپا کو بھی بُلا لیا اور وہ دونوں خوب مزے سے انور کی باتیں سنتی رہیں۔

نگاہوں کا اثر الفاظ سے شاید زیادہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ امجد کو ایسی باتوں نے کبھی دو دن سے زیادہ اُس طرف، جانے سے نہ روکا۔ کسی کے آنے پر سانس کا قدرے تیز تیز آ جانا، ایسی بات نہیں جو ہر ایک محسوس کر سکے اور فوراً ہی کسی کام میں منہمک ہو جانا بھی غالباً کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی والدہ کی توجہ خاص طور پر تسنیم کی طرف مبذول ہو۔ کیا امجد آتے ہی پہلے اپنی تائی جان کی خیر و عافیت نہ پُوچھتا تھا۔ کیا وہ سوائے تسنیم کے باقی سب سے نہایت تپاک اور خندہ پیشانی سے نہ پیش آتا تھا۔ کیا وہ جتنا عرصہ وہاں بیٹھتا بچوں کو کچھ نہ کچھ نہ پڑھاتا یا سمجھاتا تھا۔ واقعی ایسا شریف اور سعادتمند لڑکا کہاں مل سکتا ہے۔ مگر یہ خیال بھی آنے سے نہ رُکتا کہ یہ روز روز کا آنا کیا کوئی خاص معنی رکھتا ہے؟ خیر تو ایسا کیا ہوتا ہے مگر پھر بھی۔ ساتھ یہ بات بھی نہ بھولتی کہ اُسے دیر سے ہی تو اس گھر سے محبت ہے۔ بعض بندے ہوتے ہی حسب والے ہیں۔ پھر بھی لڑکیاں جوان ہیں۔ مگر امجد ہے بھی تو اپنا لڑکا کوئی غیر تو نہیں۔ باقی رہا امجد سو اس کے لئے اس گھر

ہیں ایسی جاذبیت تھی کہ اگرچہ اس نے اپنے آپ سے یہ سوال بلند آواز میں نہیں کیا تھا کہ وہاں اسے کونسی چیز لے جاتی ہے مگر یہ ضرور تھا کہ جب کبھی وہ لمبی سیاہ پلکوں والی آنکھیں اس کی طرف پانچ سیکنڈ سے زیادہ دیکھ لیتیں تو وہ یہ بھول جاتا کہ کہاں بیٹھا ہے اور آس پاس کون موجود ہے اور اس نظر کے کیا معنی ہیں، وہ آنکھیں کیا کہنا چاہتی ہیں، اس کی اپنی آنکھوں میں کیا چیز جھلک رہی ہے؛ اور اس کا اپنا دل کیوں زور زور سے دھڑکنے کے بعد فوراً بند ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خوش قسمتی ہی سمجھنی چاہیئے کہ وہ نظر اتنے عرصہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھتی۔

ایسے لمحات میں دونوں یہ بھول جایا کرتے تھے کہ ان کے خاندانی تعلقات آپس میں کیسے ہیں۔ کیونکہ دونوں کنبوں کے تعلقات بظاہر بہت خوشگوار تھے۔ جٹھانی اور دیورانی برادری کی تقاریب کے علاوہ ہفتے عشرے نہیں تو مہینے میں ایک دو بار تو ضرور ہی ایک دوسرے سے مل لیتی تھیں اور امجد کی بہنوں اور تسنیم اور نسیمہ میں اگر ہم عمری نہ ہونے کی وجہ سے بہت بے تکلفی نہ تھی پھر بھی سگے تائے چچا کی اولاد سے اور کونسا رشتہ قریب تر ہوتا ہے۔ دوسرے اگرچہ فریقین میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا، یہ بھی صحیح تھا کہ ان کی باہمی دلچسپی کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ اگر آپا مجیدہ اور آپا رشیدہ امجد کی بہنیں تھیں تو تسنیم کو اُس کی بہن نسیمہ یہ کہہ کے بھی تو چھیڑا کرتی تھی کہ "تمہارے بھائی امجد آ گئے"۔ چنانچہ جب کبھی میل جول کا موقع ملتا، دونوں ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کو نہایت توجہ اور دلچسپی سے دیکھتیں اور اپنے اپنے گھر جا کر دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے لباس، طبیعت، انداز، سلیقے، گفتگو وغیرہ غرض ہر ایک چیز کے متعلق طویل اور مفصل تبصرہ کرتیں۔

ایک دن آپا رشیدہ کی سالگرہ کے موقع پر تسنیم اور نسیمہ دونوں کو دعوت دے کر بلایا گیا۔ دعوت بہت کامیاب رہی۔ دو ایک اور سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ برسات کے دن تھے، پُوڑے پکے، صحن میں ایک طرف جھولا پڑا تھا۔ دو تین گھنٹے بہت چہل پہل رہی۔ ہنسی مذاق، لطیفوں، فقروں اور باتوں میں وقت ایسا جلد گزر گیا کہ محسوس تک نہ ہُوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سہیلیوں کو کیوں بلایا گیا تھا۔ امجد کا خیال تھا کہ آپا رشیدہ نے ضد سے انہیں بلایا تھا کہ میں اندر نہ آسکوں۔ رشیدہ کا خیال تھا کہ تسنیم کا کسی ایک شخص نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ انور کا خیال تھا کہ شاید آپا رشیدہ بھائی امجد کو مذاق کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ آپا تسنیم کو فقط مشق کے لئے بلایا ہے ورنہ بُلانا ہی تھا تو نسیمہ کو بُلا لیتیں۔ نسیمہ کا خیال تھا کہ اس بلاوے سے چچی جان کا کوئی خاص مطلب تھا۔ چچی جان کو گھر میں رونق اچھی لگتی تھی، مجیدہ نے رشیدہ سے خاص طور پر کہہ کے تسنیم کو بلوایا تھا، کیونکہ انہیں اپنی نئی بوسکی کی قمیص کی بیڈنگ کرانی تھی اور تسنیم سے اچھی بیڈنگ کوئی نہ کرتا تھا۔ سہیلیوں کو تسنیم اور نسیمہ یونہی بھلی اور خوبصورت لگتی تھیں اور تسنیم کے لئے یہ گھر خاص اہمیت رکھتا تھا۔ گویا کسی کے لئے بھی یہ موقع دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ دن بہت خوشی اور لُطف سے گذرا۔ شام سے ذرا پہلے ہی سب رُخصت ہوگئیں۔

رات کو کھانے کے بعد آپا رشیدہ نے امجد سے پوچھا " امجد آج تم اندر نہیں آئے ؟" اب یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس سوال سے ان کا کیا مطلب تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ امجد اندر نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے کہ ایک چھوڑ دو دو سہیلیاں اندر جمی بیٹھی تھیں، مگر آپا رشیدہ ایسی بات نہ کریں تو کون کرے۔ چنانچہ امجد نے فقط ایک غصے سے بھری ہوئی نظر ان کے مسکراتے ہوئے خوش شکل چہرے پر ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر انہوں نے بڑی آپا کی طرف متوجہ ہو کر اُن سے پُوچھا " آپا تمہیں معلوم ہے یہ امجد کیوں بسورے بیٹھا ہے ؟" مگر جواب کا انتظار کرنے کے بغیر ہی یہ بھی کہا کہ "تسنیم کی آپ نے ناک دیکھی ہے، پتہ نہیں کس پر ہے ؟" اس بات پر امجد کا مُنہ سُرخ ہو گیا کیونکہ جس موضوع پر اس کا اور گھر والوں کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا وہ تسنیم کی ناک تھی۔ گھر والے اونچی ستواں ناک پسند کرتے تھے، وہ خود تیکھی ناک ' نکیلی ' کہہ کے ہمیشہ ایک بالغانہ انداز سے ہنس دیا کرتا تھا۔ اسے پتلی ناک بہت بُری لگتی تھی، اس کے خیال میں ناک کی سب سے خوبصورت چیز نتھنوں کی نزاکت تھی، اگر وہ ایسے نازک اور حساس ہوں کہ معمولی سے جذبہ سے متاثر ہو جائیں تو خواہ ناک بہت اونچی نہ ہو اسے پسند آتی تھی۔ تسنیم کی ناک ستواں نہ تھی۔ مگر تھی خوش وضع اور اسے تو بہت ہی دلفریب معلوم ہوتی تھی، مگر دوسروں کے لئے ایک دائمی مذاق کا موضوع تھی۔ اس لئے اس نے فقط یہی کہا " اپنی طرف تو دیکھئے "۔ اس پر مجیدہ نے کہا " امجد تم یونہی خفا ہو جاتے ہو، رشیدہ تو ہے ہی پاگل، اس کی باتوں پر بُرا نہ مانا کرو۔ میں نے تم سے کئی دفعہ کہا ہے کہ تم ایک دوسرے سے ناراض نہ ہؤا کرو اور پھر تسنیم کی ناک کے علاوہ باقی کسی نقش کو تو کوئی بُرا نہیں کہتا۔ دوسرے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں غصہ آئے ہی کیوں کیا تمہارا اس سے بیاہ کا ارادہ ہے ؟"۔ اس سوال سے امجد بہت گھبرایا اور شرمایا بھی۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ اُٹھ جائے مگر شاید رشیدہ کا جی ابھی اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا اس نے قمیص سے پکڑ کر بٹھا لیا کہ کیوں بھاگے جاتے ہو، اس سوال میں کیا گناہ ہے۔ مگر میں تمہیں مشورہ دوں، اس خیال کو چھوڑ دو۔ اس پر وہ بہت جھنجھلایا " کونسا خیال ؟ آپ سب کا دماغ تو نہیں پھر گیا ؟ میرا کوئی اِرادہ وِرادہ نہیں "۔ اس نے جلدی سے کہا اور پھر کوشش کی کہ اُٹھ جائے۔ مگر اس دفعہ مجیدہ نے بھی کہا کہ کیوں تمہیں اتنی جلدی ہے، کبھی تو ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ یہ الفاظ شاید انہوں نے سادگی سے کہے ہوں مگر رشیدہ اور انور نے ان کے کوئی اور معنی لئے اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور امجد نے محسوس کیا دونوں مسکرا رہے ہیں۔

اس سے دو یا تین دن بعد جب امجد ادھر گیا تو اندر داخل ہوتے ہی صحن اسے کچھ بے رونق سا معلوم ہؤا۔ مگر تائی جان وہیں موجود تھیں، افضل ان کا سب سے چھوٹا لڑکا بھی وہیں تھا۔ نسیمہ بھی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ مگر مشین کے آگے کی جگہ خالی تھی۔ تسنیم اکثر وہاں بیٹھی ہوتی تھی۔ امجد سلام کر کے بیٹھ گیا مگر دل کچھ بشاش نہ رہا۔ جہاں پہلے آتے ہی ہنسی

مذاق اور چہل پہل ہو جایا کرتی تھی، آج گھر کی فضا کچھ ساکن اور خاموش سی تھی۔ امجد نے حسبِ معمول تائی صاحبہ سے باتیں شروع کر دیں کہ آپ جب دیکھو کوئی نہ کوئی کام ہی کر رہی ہوتی ہیں، کبھی تو بے کار بھی بیٹھا کیجئے۔ بیکاری اچھا شغل ہے، بیکاری سے آدمی کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق اسے سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ اور پھر دوسروں کو کام کرتے دیکھ کر ایک بے لوث خوشی محسوس ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ روح کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً میری طرف دیکھئے۔ آپ کو کام میں مشغول دیکھتا ہوں، نسیمہ بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی کرتی ہے، تسنیم بھی ضرور ہی کسی نہ کسی شغل میں لگی رہتی ہے۔ یہ لڑکے بھی محنت کرتے رہتے ہیں۔ آپ سب کو مصروف دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسے اپنی باتوں میں آج کچھ لطف نہ آیا، اگرچہ تائی جان نہایت متانت اور بُردباری سے سب باتیں سُنا کیں اور جیسا کہ ان کی عادت تھی کبھی ہنس کے، کبھی مسکرا کے کبھی ایک آدھ لفظ سے گفتگو میں شریک رہیں۔ لڑکے بھی حسبِ دستور کوئی نہ کوئی حل طلب چیز لے آئے، وقت گزرتا گیا مگر تسنیم نہ آئی۔ آخر کار امجد کو پوچھنا ہی پڑا۔ مگر اسے تائی صاحبہ سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یونہی سرسری طور پر نسیمہ سے پوچھا کہ تمہاری آپا کسی سہیلی کے ہاں گئی ہیں؟ اس نے سر ہلا دیا اور پھر یہ کہا کہ نہیں وہ تو شاید اپنے کمرے میں ہیں۔

اسی طرح ایک گھنٹہ گذر گیا۔ سب کرنے والی باتیں ختم ہوگئیں۔ نئی بات نکالنے کے لئے دماغ نہیں تھا۔ در و دیوار کی طرف زیادہ دیکھنا بھی شاید دوسروں کو اپنی بے دلی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس لئے امجد کے لئے زیادہ بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ جہاں روز طبیعت اتنی حاضر ہوتی تھی اور شگفتہ خاطری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سب کے سب اس کی باتوں پر ہنستے، خوش ہوتے اور اُن میں دلچسپی لیتے تھے، آج طبیعت پر زور دینے سے ہی لمبی چوڑی گفت گو کی طرف اپنے آپ کو راغب کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر اپنی باتیں ہی اپنے آپ کو غیر دلچسپ اور پھیکی سی معلوم ہوتی تھیں۔ یونہی خفیف سی بے چینی بھی دل میں اضطراب پیدا کر رہی تھی کہ اگر خیریت ہے اور خیریت ہی ہوگی ورنہ ضرور کسی نہ کسی سے باتوں باتوں میں سُن ہی لیتا کہ آپا کے سر میں درد ہے یا کچھ اور بات ہے۔ پھر اس خاموشی کے کیا معنی؟ بلکہ ایک دفعہ جب وہ سب تین چار منٹ تک چُپ رہے، تو امجد کو خیال ہونے لگا کہ شاید یہ لوگ آج میری موجودگی یہاں نہیں چاہتے اس لئے اُسے اپنا بیٹھا رہنا نامناسب سا معلوم ہونے لگا۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ تسنیم کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اس پر تائی صاحبہ نے ایک ایسی آواز میں جواب دیا جو اسے کچھ روکھی معلوم ہوئی "نہیں تو، شاید کوئی کام کر رہی ہوگی۔ مگر اس جواب سے اس کی تسلّی نہیں ہوئی، لہٰذا اس نے نسیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت کاپی میں پنسل سے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے سر اُٹھایا تو امجد کو اپنی طرف مستفسرانہ اور متجسسانہ انداز سے دیکھتے ہوئے پایا۔ شاید اس نے امجد کے چہرے پر ہی کچھ پریشانی کے آثار دیکھے ہوں، یا اس نے قیاساً اس کی بے چینی

اور اُداسی کو بھانپ لیا ہو۔ بہر حال وہ اُٹھی اور یہ کہہ کر " بھائی جان یہ عبارت میری دیکھئے ٹھیک ہے؟" اپنی کاپی امجد کے ہاتھ میں دے دی۔ امجد نے جو اس صفحہ کو دیکھا تو اس پر سب سے اوپر یہ حروف لکھے تھے " آج آپا تسنیم کی اباجی اور اماں جی نے کہیں منگنی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، آپا اندر بیٹھی رو رہی ہیں"۔

اس کے بعد اسے خود معلوم نہیں کہ وہ کس طرح یا کس راستہ سے گھر واپس آیا۔ یا اگر وہ روز والی سڑک سے آیا تھا تو اس پر دکانیں کھلی تھیں یا نہیں، تانگے، موٹریں یا سائیکل اسے راستے میں ملے یا نہیں، یا اسے آنے میں کتنا عرصہ لگا۔ تمام راستہ یہی اپنے آپ سے کہتا آیا کہ آخر کیا ہو گیا، ان کی لڑکی تھی، انہوں نے منگنی کر دی، یا کر دیں گے، فیصلہ تو کر ہی لیا ہوگا کر لیں۔ ہمیں اطلاع ہوتی، حب ہوتی۔ مگر یہ ضروری تو نہیں کہ سب کو فوراً ہی خبر کر دی جائے۔ خواہ وہ کتنے ہی عزیز ہوں ایسی باتوں میں مشورہ کی ضرورت تو ہوتی ہی نہیں، اور پھر مشورہ کس سے کرتے؟ ابا جان اپنے دوروں پر ہی رہتے ہیں اور امی جان سے شاید تائی جی مشورہ ہی نہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا آپس میں سلوک تو ہے مگر اتنا نہ ہوگا! یا شاید اس بات میں انہیں صلاح مشورہ کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ مگر تسنیم اور منگنی! اور فوراً اور یوں چپ چاپ! مگر پھر دل کہتا کہ آخر انہیں کیا خبر ہے کہ کسی اور جگہ بھی اس کا رشتہ ہو سکتا تھا۔ پھر خیال آتا کہ اتنے سال، خیر بہت سال نہیں، ایک دو سال سے تو اُن کے ہاں دوسرے تیسرے چلا ہی جاتا تھا۔ اس سے کسی کو کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا؟ آخر تایا جان تو خاص طور پر مہربان تھے۔ گھر والے بھی مجھ سے مذاق کیا کرتے تھے!

گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا، مگر گم سُم! کپڑے اُتارے، عادۃً ہر چیز پتلون، ہیٹ، ٹائی وغیرہ قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھ دی۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاس ایک کتاب پڑی تھی، یونہی بے توجہی میں اُٹھا لی۔ پڑھنے کے لئے آنکھیں صفحات پر سے سطر در سطر گذرنے لگیں، مگر الفاظ کے لغوی معنی اگر دماغ میں آجاتے تھے تو جملوں کا مطلب فوت ہو جاتا تھا یونہی اندھا دھند دو تین صفحات پڑھ ڈالے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ نظر الفاظ پر ہی تھی مگر یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟ تسنیم کی منگنی انہوں نے کیسے کر دی۔ تسنیم کیسے کسی اور کی ہو جائے گی! تسنیم کی آنکھیں! تسنیم کی پلکیں! تسنیم کے ہونٹ!

کھانے کا وقت آیا تو امجد ابھی کمرے ہی میں تھا۔ بستر پر لیٹا ہوا چھت پر نظر گاڑے اسی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے کیوں منگنی کر دی؟ اور ایسے چُپ چُپ کیوں کر دی؟ اب کیا ہو سکتا ہے! اب تو شاید کچھ نہیں ہو سکتا مگر شاید ہو سکتا ہو، کیا خبر اُنہوں نے آپس میں فیصلہ کیا ہے یا لکھ کے بھیج دیا ہے؟ مگر بات ضرور پکی ہو گئی ہوگی ورنہ نسیمہ کو کیسے پتہ لگتا اور پھر تسنیم کیوں سامنے نہ ہوئی، اسے دیکھ تو لیتا!

مگر کرن اُن سے کہے؟ کسی کو ضرورت ہی کیا ہے، گھر میں کسی کو کیا پروا ہے؟ میں خود بھی کچھ نہیں کر سکتا! تایا جان سے میں نہیں کہہ سکتا، تائی جی سے کہنا تو بالکل ہی ناممکن ہے، اپنی اُمی جان سے اور بھی مشکل ہے اور ابا جان سے جا کر کہنا ہی فضول اور عجیب دکھائی دیتا ہے! کیا کیا جائے؟ آخر کس طرح کچھ کیا جائے! دماغ سُن معلوم ہوتا تھا، خیالات بے ربط ہوتے جاتے تھے، مگر جو سوال بار بار آ کر سب احساسات پر چھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ اتنی جلدی کیونکر ہو گیا؟ دو تین دن ہوئے وہ ہمارے ہاں دعوت پر آئی ہوئی تھی اور اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہم سے چھوٹ کر کہیں اور جا بسی ہے اور دل کی کیفیت عجیب تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز کسی نے چھین لی ہے!

شام ہو گئی تھی مگر کمرے میں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ عرصے تک تو کوئی ادھر نہ آیا مگر پھر تشویش ہوئی تو رشیدہ نے آ کے آواز دی۔ پہلی آواز پر تو اس کا جواب دینے کو جی نہ چاہا مگر دوسری پر اسے جواب دینا ہی پڑا۔ ساتھ ہی اس نے جلدی سے بٹن بھی دبایا روشنی ہو گئی تو رشیدہ اندر آ گئی اور اس نے پوچھا "خیر تو ہے اندھیرے میں پڑے ہو" امجد نے کہا "نہیں تو، یونہی آرام کر رہا تھا۔ کھانا تو تیار ہو گا؟ چلو کھانا کھائیں" مگر ہر وقت ساتھ رہنے والوں اور پھر بڑی بہنوں جیسی تیز نظر والیوں کو پژمردگی خواہ وہ آواز میں ہی چھپی ہوئی ہو محسوس ہو ہی جاتی ہے۔ رشیدہ نے غور سے امجد کے چہرے کی طرف دیکھا مگر اس وقت زیادہ استفسار شاید قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔ بہرحال وہ دونوں باورچی خانہ کے ملحقہ کمرے میں چلے گئے، جہاں عام طور پر کھانا ہی کھایا جاتا تھا۔ بڑی آپا بھی وہیں موجود تھیں اور چھوٹی سعیدہ اور انور بھی۔ کھانے کے دوران میں تقریباً ہر ایک نے کم و بیش محسوس کیا کہ اس کی طبیعت کسی وجہ سے پریشان ضرور ہے کیونکہ اس میں روز کی سی بشاشت نہ تھی اور نہ وہ کھانے ہی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ آج شام امجد اُدھر گیا تھا، کیونکہ جاتے وقت حسب معمول پھر آپس میں مذاق ہوئے تھے اور رشیدہ نے گانا شروع کر دیا تھا "گجرا بیچن والی تو کہاں چلی" مگر اس وقت کسی کو مذاق کی نہ سُوجھی کیونکہ امجد کا چہرہ کچھ اُترا ہُوا اور قدرے افسردہ معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کھانے کے بعد جب انور اور سعیدہ چلے گئے تو مجیدہ نے جس سے رشیدہ نے اشاروں اشاروں میں کچھ کہا تھا، امجد سے پوچھ ہی لیا کہ خیر تو ہے تم کچھ اُداس اُداس سے لگتے ہو۔ مگر امجد نے کچھ جواب نہ دیا اور دو بار پوچھنے پر بھی کہا کہ کچھ نہیں اور پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بعد میں دونوں بہنوں میں کچھ گفتگو اسی بارے میں ہوئی کہ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے، ورنہ جس وقت گھر سے روانہ ہُوا تھا، بات بات کا جواب دیتا تھا۔ بلکہ رشیدہ نے کہا کہ جب میں وہ گیت "گجرا بیچن والی تو کہاں چلی" گاتی تھی تو ہنس ہنس کے میری آواز کی نقل اُتارتا تھا اور اب غیر معمولی طور پر چپ چاپ اور خموش ہے۔ کوئی بات ایسی ہو گئی ہے ورنہ امجد کی تو عادت ہی تھم کر بیٹھے رہنے کی نہیں۔ جب تک کسی سے ہنسی، کسی سے ٹھٹھا نہ کر رہا ہو، یا اپنی کوئی رام کہانی نہ سنا

رہا ہو، اسے آرام نہیں آتا۔ مگر چونکہ اس سے دوبارہ پوچھنے پر بھی امجد نے انہیں عمداً ٹال دیا تھا، اس لئے انہوں نے اُس رات اس سے مزید استفسار مناسب نہ سمجھا اور پھر انہیں یہ خیال تھا کہ اگر کوئی ایسی ہی بات ہوئی تو خود ہی پتہ لگ جائے گا، ورنہ دن تو چڑھنے دو، ممکن ہے واقعی کوئی بات نہ ہو، مگر دل نہ مانتا تھا کہ امجد کی چپ بے وجہ ہے۔

دوسرے دن بھی جب انہیں امجد کو دیکھنے یا اس سے بات کرنے کا موقع ملا، تو اُنہوں نے دیکھا کہ امجد کی افسردگی عارضی نہ تھی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس کی تہ میں ضرور ہی کوئی پریشانی والی بات ہے۔ کیونکہ امجد یا تو کالج سے آنے کے بعد کم ازکم آدھا گھنٹہ ان کے ساتھ، اِدھر اُدھر کی باتوں میں صرف کیا کرتا تھا یا اس دن کالج سے آکے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہ دونوں پھر چپ رہیں اور انہوں نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ مگر جب دو ایک روز یہی اس طرح گزر گئے اور یہ صاف ظاہر ہونے لگا کہ امجد نہ تو ویسا بشاش ہی تھا جیسے اس کی طبیعت تھی اور نہ وہ اپنے مرغوب اصُولوں پر ہی اب کوئی گفتگو کرتا تھا۔ اور نہ ان کے پاس اب وہ بیٹھتا ہی تھا تو انہیں اور بھی تشویش اور تجسس ہُوا۔ اور اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ اتنے دنوں میں وہ ایک دفعہ بھی سہ پہر کے وقت کپڑے پہن کر باہر نہ گیا۔

ادھر امجد کا اضطراب اور بھی بڑھنے لگا۔ کیونکہ اب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اگر کچھ ہونا چاہئے تو جلدی ورنہ جتنی دیر ہوتی جائے گی اتنی ہی ادھر منگنی پختہ ہوتی جائے گی۔ کچھ اسے خیال سا ہوگیا کہ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں، وہ عہد وپیمان یا جو کچھ فیصلہ یا اقرار تایا جان نے کسی کے ساتھ تسنیم کے بارے میں کیا ہوگا، وہ اور بھی مضبوط اور اٹل ہوتا جا رہا ہے۔ مگر وہ خود بے بس تھا۔ وہ خود کر ہی کیا سکتا تھا، وہ خود تو کسی سے بھی کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اگر تایا جان سے، فرض ہی کرلو، وہ کچھ کہہ ہی دے اگرچہ یہ بات بھی ہی ناممکن، مگر بالفرض کر ہی لے تو سوائے اس کے کہ تایا جان اسے پاگل سمجھیں اور کیا فائدہ حاصل ہوگا، اور تائی جان سے تو کچھ کہنا ہی اس کی قدرت سے باہر تھا اپنی والدہ سے بھی تو وہ خود نہیں کہہ سکتا تھا۔ اپنی طرف سے وہ کیا خود ایسی بات تجویز کرسکتا تھا؟ توبہ! توبہ!! اگر کہہ ہی دے تو امی جان، نہ معلوم کس حیرت اور شاید صدمہ اور شاید غصّہ سے کیا کہہ ڈالیں!

اس لئے امجد دل ہی دل میں تلملاتا تھا اور اپنی بے بسی اور بے چارگی پر دانت پیستا تھا۔ مگر سب سے زیادہ جو بات اسے تکلیف دیتی تھی وہ یہ تھی کہ اسے یہ محسوس ہونے لگا گویا کوئی چیز جس سے اس کی زندگی وابستہ تھی لحظہ بلحظہ اس سے دُور ہٹتی چلی جاتی ہے۔ جیسے اس کے پاؤں کے نیچے ریت ہو اور وہ پہلے آہستہ آہستہ پھر بتدریج تیزی سے پاؤں تلے سے سرکتی جائے اور معلوم نہ ہو کہ اب کیا ہو جائے گا۔ اور دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا۔

مجیدہ اور رشیدہ نے جب یہ پریشانی بڑھتی دیکھی تو چوتھے دن انہوں نے امجد کو مجبور کرکے اس سے پوچھ ہی لیا۔ سن کے

وہ بھی بہت پریشان ہوئیں۔ رشیدہ جیسی شوخ طبع بھی چپ کی چپ ہی رہ گئی۔ مجیدہ نے امجد سے پوچھا "کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ چُپ تھا۔ کیا جواب دیتا، تنہائی میں اپنے آپ سے کسی قسم کی جھجک کے بغیر تسنیم جیسی چیز کا مطالبہ کر سکتا تھا، دو بڑی بہنوں کے سامنے وہ کیا کہتا۔ مگر چونکہ انہیں خود احساس تھا، اس لئے انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے؟ مگر امجد نے کہا "میں آپ کو کیا بتاؤں۔ مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔ میں اماں سے نہیں کہہ سکتا، میں تایا جان سے کیا کہہ سکتا ہوں اور جب کہ وہ کہیں پہلے ہی منگنی کر دینے کا فیصلہ اگر کر نہیں چکے تو کر رہے ہیں" رشیدہ نے کہا "آپا اگر اماں سے آپ کہیں تو کیا حرج ہے۔ آپ بڑی ہیں اور بیاہی ہوئی ہیں، اماں آپ کی عزت بھی کرتی ہیں، اگر آپ اماں سے کہیں کہ امجد کے لئے وہ تایا جان سے تسنیم کا رشتہ مانگ لیں تو وہ کیوں نہ آپ کی بات مان لیں۔ اور اگر اماں نے مانگ لیا تو یہ نہیں ہو سکتا کہ تایا جان انکار کر دیں۔ میں بھی آپ کے پاس ہی ہوں گی، میں بھی ہاں میں ہاں ملا دوں گی، اور مجھے تو یقین ہے اگر آپ اصرار سے کہیں تو اماں ضرور ہی آپ کا کہا مان لیں گی۔ تسنیم تو بہت پیاری سی لڑکی ہے، اس سے اچھی ہمیں کہاں ملے گی"۔

دوسرے دن جب کالج سے آ کر امجد نے رشیدہ سے علیحدگی میں پوچھا تو اس نے کہا "امجد مجھے بہت افسوس ہے بے حد ہی، اور آپا کے تو آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے تھے مگر اماں کہتی ہیں کہ اگر تمہارے تایا جان نے ہم سے مشورہ کئے بغیر ہی تسنیم کی منگنی کہیں اور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم کس منہ سے ان سے رشتہ مانگ سکتے ہیں۔ کم از کم میں تو رشتہ تمہاری تائی سے مانگنے سے رہی۔ اور جب ہم نے یہ کہا کہ امجد کو تسنیم بہت پسند ہے تو انہوں نے کہا، 'وہ ابھی بچہ ہے، اس کا کیا ہے جس کے ساتھ اس کی شادی کر دیں گے، اسے وہی پسند آ جائے گی'"۔

سیّد فیاض محمود

بودا تھا اگر ایسا پیمانِ شناسائی
کیوں مجھ کو دو عالم سے بیگانہ بنایا تھا

خوشی کا راگ

مست رہ ـــــ خوشی منا ـــــ عیش کر

تُو دُکھ بھی سہہ ـــ تو مست رہ
خطر بھی ہو ـــ تو عیش کر
مزے اُڑا ـــ خوشی منا

مست رہ ـــــ خوشی منا ـــــ عیش کر

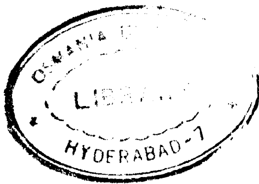
ترا جہاں ـــ ہے اک سماں
ابھی ہے کچھ ـــ ابھی ہے کچھ
تری یہ جاں ـــ ہے اک دیا
ابھی جلا ـــ ابھی بجھا
سو بے خبر! ـــ تُو ہو نڈر
کہ بے سبب ـــ ہی روز و شب

مست رہ ـــــ خوشی منا ـــــ عیش کر

ہے سب کا تُو ـــ برنگِ بُو
مگر یہ سب ـــ ہیں اپنے کب
گل و ثمر ـــ بہم دگر
کوئی ہے یُوں ـــ کوئی ہے وُوں
بھلا کوئی ـــ بُرا کوئی

مگر ہے کیا بھلا بُرا ؟
بھلائیاں بُرائیاں
ہیں سب فقط ہوائیاں
یہ جان کر یہ مان کر
مست رہ — خوشی منا — عیش کر

خوشی بھلی مگر کبھی
یہ غم نہ کر کہ خوش ہو تُو
ہو رات دِن یہ جستجُو
خوشی ملے مِلے خوشی
گدا نہ بن بن آدمی
ہے آدمی وہ آدمی
جو دُکھ سے بھی جو سُکھ سے بھی
نہ زیر ہو دلیر ہو
ہو جس کا دل نہ مضمحِل
جو آپ سے یہی کہے
کہ جانِ من تو مرد بن
جو ہو سو ہو جو ہو سو ہو
تُو مرد بن کے جانِ من
مست رہ — خوشی منا — عیش کر


OSMANIA ... LIBRA... HYDERABAD-7

ب ل

چند نغمے

(۱)

اُٹھی حورِ سحر انگڑائی لے کر خوابِ نوشیں سے
چمک اُٹھا جہاں اُس کے تبسّم ہائے رنگیں سے
ہر اِک ذرّے میں خورشیدِ تجلّی جلوہ آرا تھا
ہر اِک قطرے میں بحرِ حُسن کا طوفان برپا تھا
ہر اِک گُل میں تھی جنّت کی بہارِ رنگ و بُو گویا
فضائے دہر پر چھایا ہُوا تھا تُو ہی تُو گویا
مرے لب پر تھا تیرے حُسن کا کیف آفریں نغمہ!

(۲)

عجب انداز سے بامِ فلک پر آفتاب آیا
شبابِ حُسنِ عالم سوز لے کر بے نقاب آیا
لہو دوڑا رگِ ہستی میں سیلِ آتشیں ہو کر
گرے کونین پائے حُسن میں لوح جبیں ہو کر
ہر اِک ذرّے کا سینہ ایک بحرِ بیقراری تھا
دلِ کون و مکاں پر اضطرابِ شوق طاری تھا
مرے لب پر تھا سوزِ عشق کا اِک آتشیں نغمہ!

(۳)

شبِ تاریک آخر چھا گئی پہنائے عالم پر
لگائی یاس نے اک چوٹ تارِ بربطِ غم پر
جہانِ رنگ و بُو اک درد کی تصویر تھا گویا
سرودِ آبادِ ہستی نغمۂ دلگیر تھا گویا
فضائیں تیرہ و تاریک تھیں مغموم آہوں سے
ٹپکتی تھیں ہزاروں حسرتیں غمگیں نگاہوں سے
مرے لب پر تھا انجامِ محبت کا حزیں نغمہ!

(۴)

بہت گائے ترے حُسنِ جنوں انگیز کے نغمے
بہت گائے جنونِ عشقِ محشر خیز کے نغمے
مری رنگیں نوائی سے جہاں مسرور رہتا تھا
مرے آشفتہ نغموں سے جہاں رنجور رہتا تھا
ترے جلوے بھی بے پایاں، مری اُلفت بھی بے پایاں
مرا اظہارِ حُسن و عشق تھا مجذوب کا ہذیاں
مری خاموشیوں میں موجزن ہے بہتریں نغمہ!

اثر صہبائی

برسات کی شام

خواب گاہِ روح پر چھایا ہے ابرِ سرخوشی
سکر کے عالم میں بیٹھا ہوں کنارِ گومتی

لائی ہے محبوبۂ فطرت کی جانب سے پیام
ایک رومان آفریں برسات کی رنگین شام

ہیں خمار آگیں دھندلکے ہر طرف چھائے ہوئے
شام کے بھیگے ہوئے گیسو ہیں لہرائے ہوئے

نم ہوا میں کھُل گیا ہے طرّۂ موجِ شمیم،
بادلوں کے سائے میں تھم تھم کے چلتی ہے نسیم

رُوح پر طاری ہے عنّابی فضاؤں کا خُمار
آسماں ہے کس مصوّر کا اچھوتا شاہکار؟

کچھ طلسمی وادیاں ہیں کچھ جزیرے خوابناک
کچھ پہاڑی سلسلے ہیں دُور تک ہمرنگِ خاک

پھر طلسمی وادیوں میں لہلہاتے سبزہ زار
نقرئی لہروں کی جھیلیں، جگمگاتے آبشار

اور کچھ ہٹ کر وہ اِک ندی ہے بل کھاتی ہوئی
رقص کرتی سانپ کے مانند لہراتی ہوئی

شامِ رنگیں کے گلابی سیل میں ڈوبے ہوئے
تیرتے ہیں آتشیں موجوں پہ ٹکڑے برف کے

کچھ زمرد کے سمندر، کچھ سنہری کشتیاں
پھر سنہری کشتیوں کے ارغوانی بادباں

دامنِ کہسار میں پگھلے ہوئے ہیروں کی جھیل
اور فرازِ کوہ پر ابرِ رواں کے مست فیل

مست فیلوں کے جلو میں شوخ سبزوں پر سوار
بانکے ترچھے سورماؤں کی قطار اندر قطار

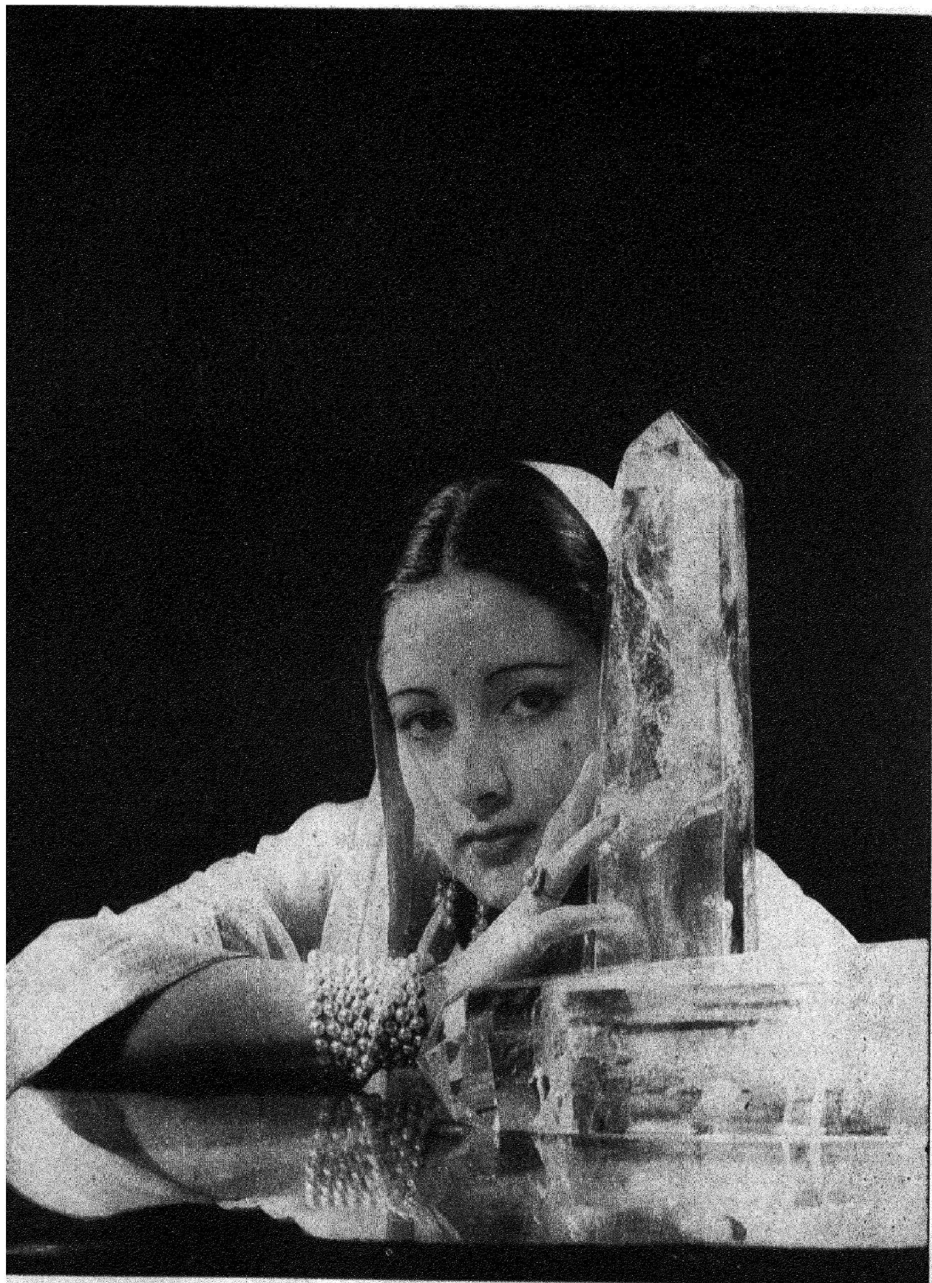
وُہ اُفق پر دُور کچھ ایواں کھڑے ہیں بے سُتوں
جن کے اوپر اُڑ رہے ہیں کچھ پھریرے نیلگوں

بجلیوں کی لہر کے مانند بل کھاتے ہوئے
کچھ سُنہرے راستے ہیں دُور تک جاتے ہوئے

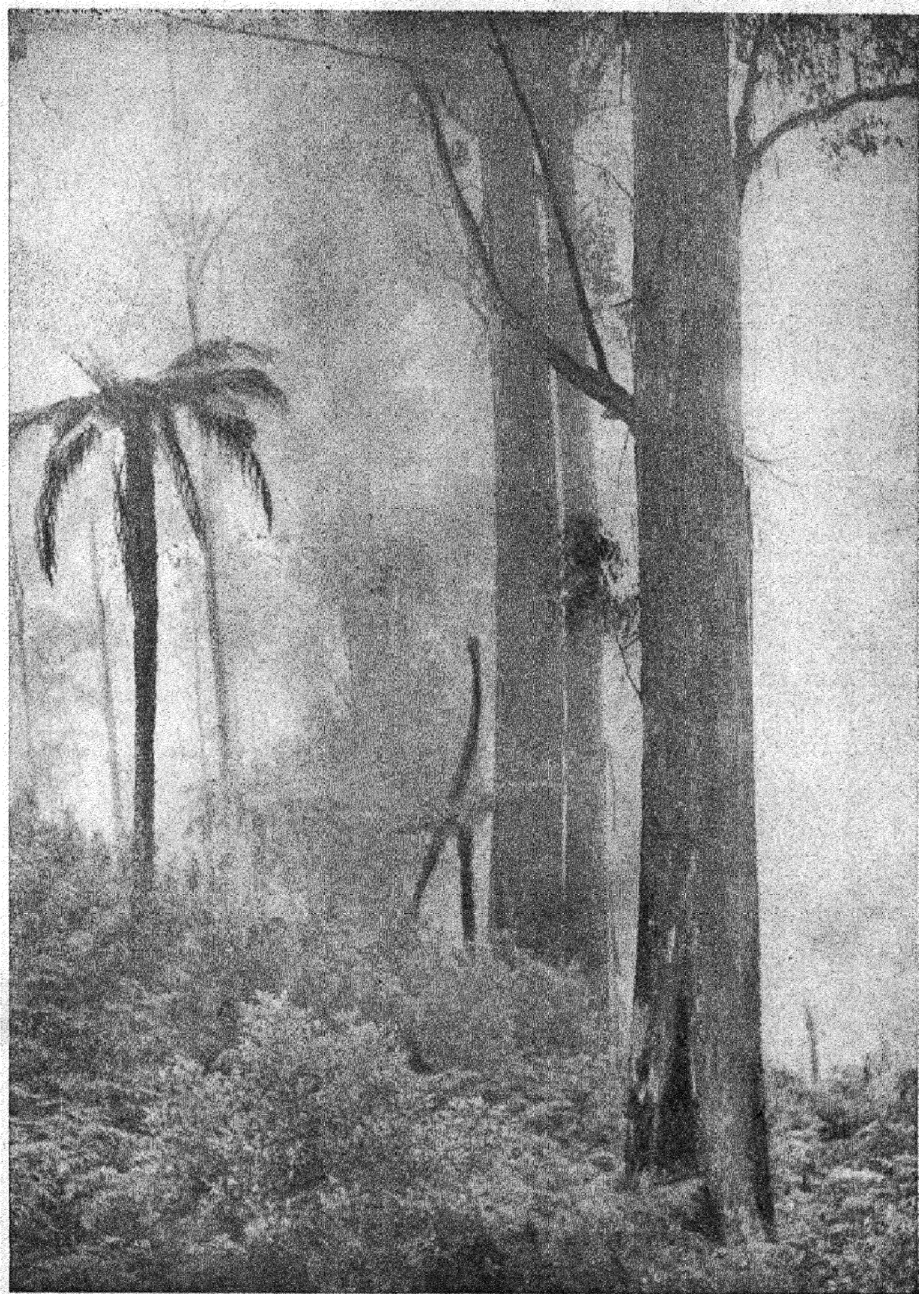
سُرمئی، نیلے، گلابی بادلوں کے درمیاں
رقص کرتی پھر رہی ہیں رنگ کی شہزادیاں

پھُوٹ نکلے ہیں شفق سے نغمہائے سرمدی
بن گیا ہے آسماں ایمن کی دلکش راگنی

ذوقی



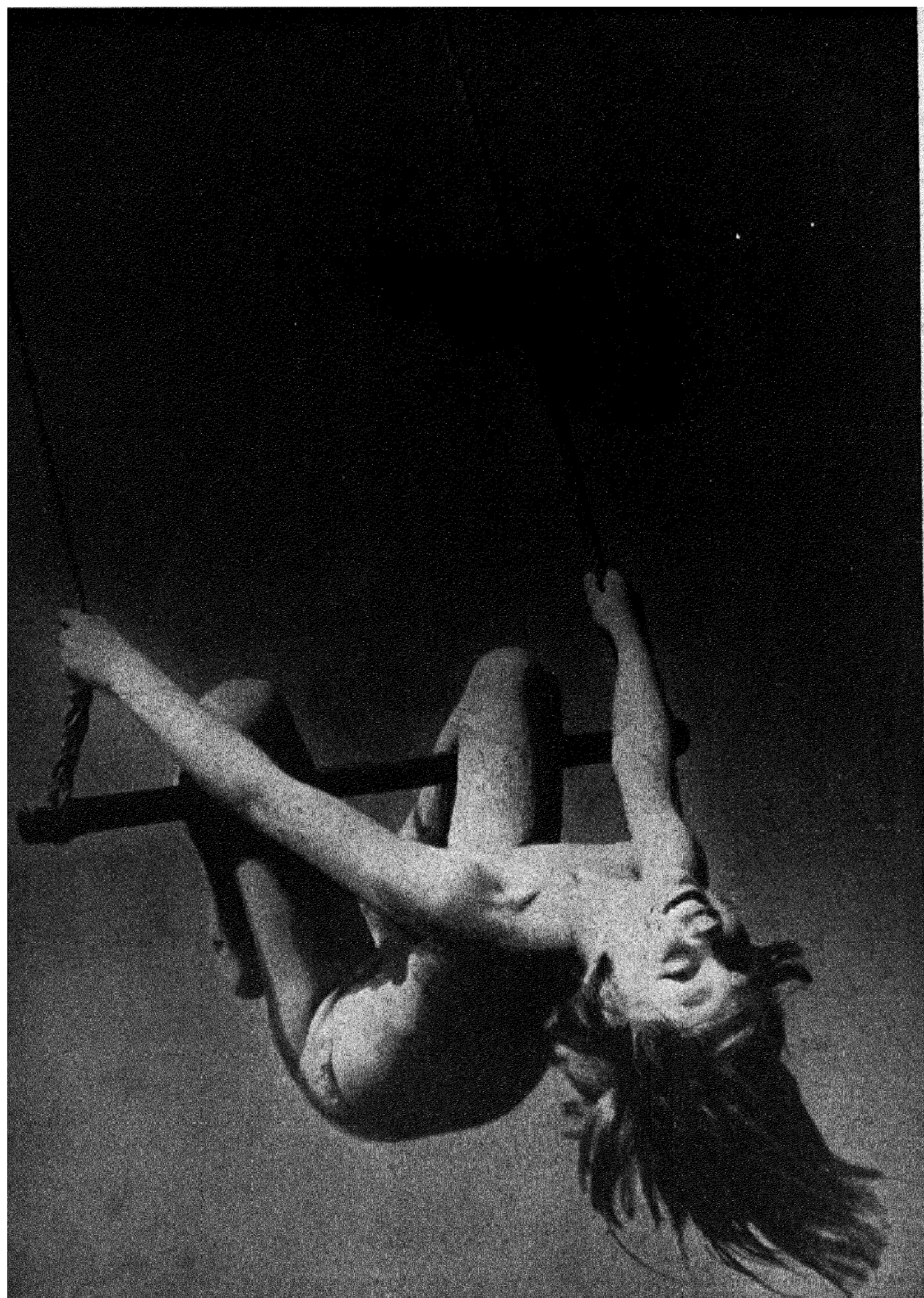
حسن بلوریں



نطری تفاسب



مصنوعی تناسب



جهولا

غزل

عید ہے عید۔ اُٹھا رطلِ گراں اے ساقی!
مجھ کو پہنچا دے وہاں۔ تُو ہی جہاں اے ساقی!

بادۂ خود جس سے ہی سرشار، عطا کر وہ شے
فاش کرنا ہے مجھے رازِ نہاں اے ساقی!

جذب کر دے مرے مینا میں خمستانِ جنوں
کہ بدلنا ہے مجھے نظمِ جہاں اے ساقی!

ایک مستانہ نظر ڈال دے پیمانے پر
کہ رہوں تیری طرح میں بھی جواں اے ساقی!

تشنۂ روزِ ازل ہوں۔ وہ مئے کُہنہ پلا
مست ہے جس سی خراباتِ جہاں اے ساقی!

کر دے آفاق کو صہبائے یقیں سی مدہوش
یہ ہے آوارۂ صحرائے گماں اے ساقی!

اور ساقی بھی ہیں۔ مینا و مے و ساغر بھی
تیرے ہاتھوں کا مگر جام کہاں اے ساقی!

کیف میں ڈوب کے ہر شعر غزل کا نکلا
فیض تیرا ہے مرا حُسنِ بیاں اے ساقی!

کوثر آیا ہے گھٹا بن کے چمن ہے فردوس
نشترِ تشنہ بھی ہے۔ تُو ہے کہاں اے ساقی!

ابونعیم نشتر جالندھری

عورت کے تصوّرات



(ڈراما)

منظر: نیوم ایکسپرس کے اُس حصے کا ایک کمرہ جس کا ایبیر: یا کے جہاز سے میل ہوتا ہے۔ بہار کی ایک خنک اور خوشگوار صبح ہے۔ ایک درمیانی سٹیشن سے گاڑی روانہ ہو رہی ہے کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے اُور اس کی تنہا ذخیل کو جو پینتیس سال کی ایک خوبصورت عورت ہے سر کے خفیف خم سے آداب بجالاتا ہے۔

عورت — کیسا اچھا اتفاق ہُوا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ کیا آپ بھی ایبیر: یا جا رہے ہیں؟

مرد — جی ہاں۔

عورت — خوب! تو گویا ایک طویل گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی بھی تھی۔ اگرچہ میرے شوہر کو ہمیں متعارف کرائے دو ہفتے بھی نہیں گزرے مگر یوں معلوم ہوتا ہے ہم صدیوں سے واقف ہیں۔ یہ فقرہ بہت پامال ہوچکا ہے۔ کیوں ہے یا نہیں؟ مگر میں فی الواقع دلی جذبہ کا اظہار کر رہی ہوں۔

مرد [مسکرا کر سر کو ذرا جھکاتا ہے]

عورت — ہاں دیکھئے نا، میں آپ کا ناول پڑھ رہی تھی۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ میں اس کی گہری نفسیاتی نازک خیالیوں سے کس قدر محظوظ ہوئی ہوں۔ اس ناول نے تو میرے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ آپ کی گزشتہ سال کی عالمانہ اور نفیس داستان ——

مرد — (منکسرانہ) اجی!

عورت — نہیں نہیں، میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے اسے پڑھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی آپ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو بطورِ معاوضہ آپ کو اپنی ایک چھوٹی سی کہانی سُناؤں گی۔

مرد — ضرور۔

عورت — اس واقعہ کو پیش آئے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ شاید دس سال، لیکن میرے حافظے پر اب تک اس کے نہایت شوخ نقوش ثبت ہیں —— غیر معمولی طور پر شوخ۔

[گاڑی پوری رفتار سے چلنے لگتی ہے]

مرد — ہاں مجھے ضرور سنائیے۔

عورت — جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، دس سال کی بات ہے کہ میں فیوم میں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ جہاں سے ہم دونوں نے مل کر گھر جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ لیکن آخر مجھے اُن کا تار ملا۔ انہیں کسی وجہ سے اپنی روانگی ملتوی کرنی پڑی تھی چنانچہ مجھے تنہا واپس جانا پڑا۔ میں نے فوراً فسٹ کلاس کا ایک ڈبا ریزرو کرایا اور بڈاپسٹ روانہ ہوگئی۔

[وقفہ]

عورت — فیوم سے کچھ سٹیشن دُور پہنچنے پر میرے کمرے میں ایک لفٹننٹ داخل ہُوا۔ میں نہیں کہہ سکتی بلاز کا سٹیشن تھا یا لوغ کا، مگر تھا کوئی ایسا ہی چھوٹا سٹیشن۔

مرد — کہانی پر یہ بات اثر انداز ہوتی ہے ؟

عورت — جی نہیں، اس سے کوئی بحث نہیں۔ بہر حال لفٹننٹ داخل ہُوا اور اب اس کمرے میں ہم دو ہو گئے : چھوٹی چھوٹی موچھوں والا ایک نوجوان فوجی افسر اور ایک نوجوان خوبصورت عورت۔ یہ میں تھی۔ لیکن یہ واقعہ اتنی مدت کا ہے کہ میں اب خوبصورت عورت کہہ کر اُس کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتی۔

مرد [ایک پُر معنی انداز میں "اجی!" کہہ کر اظہارِ تحسین کرتا ہے]

عورت — پہلے پہلے لفٹننٹ فقط باہر میدان کی طرف دیکھتا رہا لیکن رفتہ رفتہ اس نے میری طرف توجہ کی اور فی الحقیقت میں تھی بھی توجہ کے قابل۔ میں گہرے نیلے رنگ کا ایک دلفریب فراک پہنے ہوئے تھی — مگر خیر اس ذکر کی ضرورت نہیں بہر حال اُس نے مجھے دز دیدہ لیکن نہایت باریک بین نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ میں بظاہر اخبار پڑھنے کے دھیان میں لگی تھی لیکن درپردہ اس کی حرکات و سکنات کا معاینہ کر رہی تھی۔ دیکھئے نا! مجھے ایک طویل سفر درپیش تھا اور اس چھوٹے سے ڈبے میں ایک پُورا دن مجھ کو اس اجنبی سپاہی کے ساتھ بسر کرنا تھا۔ یہ صُورتِ حالات بڑی بے ڈھب تھی۔ ایسی حالت میں آپ یقیناً مجھے قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

مرد — ہرگز نہیں۔

عورت — تھوڑی ہی دیر کے بعد واقعات پیش آنے شروع ہو گئے۔ گاڑی ایک طرف کو مڑی اور دھوپ سیدھی لفٹننٹ کی آنکھوں پر پڑنے لگی۔ چنانچہ وہاں سے اُٹھ کر وہ میرے مقابل کی نشست پر آبیٹھا جہاں سے وہ میرا اور بھی اچھی طرح مطالعہ کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی پُر گو تھیں۔ چنانچہ جب میں نے پہلے پہل اُن میں نظر ڈالی تو وہ میری طرف استفہام کے

انداز میں اُٹھی ہوئی گویا یہ پوچھ رہی تھیں "پیاری خاتون مجھے اجازت ہے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں؟" میں نے آج تک ایسی فصیح البیان آنکھیں نہیں دیکھیں جو اس خوش اسلوبی سے اپنا مدعا بیان کر سکیں۔ "دیکھو میں کس احترام آمیز فریفتگی سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم نے میرے اثر پذیر سپاہیانہ دل کو ایک بھڑکتا ہُوا شعلہ بنا دیا ہے؟ مجھ پر رحم کھاؤ"

مرد —— اور آپ نے کیا کیا؟

عورت —— میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں تمہاری توجہات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ گویا میں نے کہا "لو ہمارے درمیان جو پردہ حائل تھا اٹھ گیا اور اب . . . . رُو در رُو" اُس نے مجھ پر ایک احسانمندانہ نظر ڈالی اور آنکھوں کے ایک خاموش وعدے سے مجھے اطمینان دلایا کہ میں یہ بات نہ بھُولوں گا کہ ایسے موقع پر ایک خاتون کے متعلق کسی شریف آدمی کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے۔ میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

مرد —— پھر وہ اپنے وعدے پر قائم رہا؟

عورت —— ذرا صبر کیجئے۔ میں ابھی بیان کرتی ہوں۔ وہ دیر تک مجھ کو خوابناک شرمیلی اور ادب آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ نہایت پُراثر انداز میں پرستارانہ احترام کے ساتھ مجھے دیکھنے میں محو معلوم ہوتا تھا۔ پھر اُس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور دیکھ کر مسکرایا۔ گویا وہ یہ کہہ رہا تھا "کیسے نازک نازک سفید ہاتھ ہیں" اس کے بعد اُس نے میرے قدموں پر اس طرح ایک سکون آمیز اور بے تعلقانہ نظر ڈالی جس طرح شریف لوگ عموماً ایسی چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں جو اُن کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ ایک عرصے تک وہ یوں ہی سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتا رہا اور میری آنکھوں نے جواب میں کہا "آہ"

مرد —— آپ کی آنکھوں نے کیا جواب دیا؟

عورت —— انہوں نے کہا آہ! ایک کسل آمیز پُرمسرت "آہ" جس میں نخوت کی خفیف سی جھلک بھی تھی۔ لیکن یہ آہ میرے لبوں سے نہ نکلی تھی بلکہ میں یوں نظر آئی تھی۔

مرد —— اور سپاہی؟

عورت —— سپاہی نے میرا مفہوم قابلِ تعریف طور پر درست سمجھ لیا۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہُوا۔ صرف اس کی حکایت طراز آنکھوں میں افسوس جھلکنے لگا۔ گویا وہ کہہ رہا تھا "کیا یہ تقدیر کا ظلم نہیں؟ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت سے مثالی مناسبت ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی چھپتی ہوئی نظروں کا مفہوم تک سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے اجنبی رہنے پر مجبور ہیں" اُس نے ایک آہِ سرد بھری اور پھر کہا "الوداع!"

مرد ——— کس طرح ؟

عورت ——— اپنی آنکھوں سے۔ اپنی آنکھوں سے اس نے میرے ہاتھوں پر ایک پاکیزہ اور محبت آمیز وداعی بوسہ دیا پھر اس نے تاسف سے اپنا سر ہلایا اور اُس کی آنکھوں نے کہا "بس اب کبھی نہیں"۔

مرد ——— کبھی نہیں ؟

عورت ——— جی ہاں! "کبھی نہیں . . . کبھی نہیں . . . " اس اثنا میں ہماری گاڑی ایگرام پہنچ چکی تھی جہاں وہ اُتر گیا اور میری نگاہوں نے سچے افسوس کے ساتھ دُور تک اس کا تعاقب کیا۔ وہ ایک شریف اور مہذب نوجوان تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر نکل گیا . . . اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں اُسے کبھی نہ بھولوں گی۔ مجھے خلوت کی اس سے زیادہ دلاویز اور شاعرانہ گفتگو کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اس کے بعد جب کبھی مجھے مردوں کا اُجڈپن ناگوار گزرا ہے میں نے ہمیشہ اُس سپاہی کو محبت اور احترام سے یاد کیا ہے۔ ایسا نیک طینت آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا اور میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ مجھ سے کبھی کسی نے اُس کی طرح محبت نہیں کی ——— پُر خلوص، بے غرض اور مایوس! جب میں ان واقعات پر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالتی ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں خود بھی اس کی والہانہ محبت میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ مگر خیر گزرا ہُوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔

مرد ——— میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

[طویل خاموشی]

عورت ——— معاف فرمائیے، آپ نے کچھ کہا تھا ؟

مرد ——— میں نے کہا تھا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عورت ——— کس بات کے لئے ؟

مرد ——— اُن اچھی اچھی باتوں کے لئے جو آپ نے ابھی میرے متعلق کہی ہیں۔

عورت ——— آپ کے متعلق کہی ہیں ؟

مرد ——— جی ہاں میرے متعلق۔ وہ لفٹننٹ میں ہی تھا۔

[وہ پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ عورت گھور گھور کر اُس کے چہرے کا معائنہ کرتی ہے۔ مرد اپنی جیب سے ایک نیلا کاغذ نکال لیتا ہے اور ذیل کی گفتگو کے دوران میں اُسے اپنے ہاتھ میں لئے رہتا ہے]

عورت ——— یہ کاغذ کیسا ہے ؟

مرد ـــــ کچھ نہیں، شاید بعد میں آپ کو میں یہ دکھا دوں۔

عورت ـــــ اچھا . . . . تو آپ وہ لفٹننٹ ہیں ؛

مرد ـــــ جی ہاں - میں چار سال سے ملازمت چھوڑ چکا ہوں - میں ہی وہ لفٹننٹ تھا۔ میں پلاز کے سٹیشن سے سوار ہُوا تھا اور ایگرام کے سٹیشن پر اُترا تھا۔ میری وردی پر نارنجی زرد گوٹ لگی تھی۔

عورت [حیران و ششدر] ـــــ ہاں ہاں !

مرد ـــــ دیکھئے آپ کو یاد آگیا نا ؛

[بہت طویل خاموشی]

عورت ـــــ اچھا ـــــ تو یہ آپ تھے - حیرت ہے !

مرد ـــــ حیرت کیسی ؛ مجھے تو اس میں کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوتی۔

عورت ـــــ بات یہ ہے کہ جب میرے شوہر نے ہمیں متعارف کرایا تو مجھے آپ کی آنکھیں عجیب آشنا سی معلوم ہوئی تھیں - اب سمجھی اس کی وجہ کیا تھی۔

مرد ـــــ اچھا - آپ کو واقعی یہ احساس ہُوا تھا۔ کاش میں بھی آپ کی آنکھوں کے متعلق یہی کہہ سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کو قطعاً بھُول چکا تھا - میں تو اس تمام واقعے کو فراموش کر چکا تھا لیکن اب آپ کے یاد دلانے پر ایک ایک بات میرے حافظے پر روشن ہو گئی ہے۔

عورت [دلگیر ہو جاتی ہے]

مرد ـــــ دیکھئے بات یہ ہے کہ کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ مجھے یہ واقعہ یاد رہتا - دس سال قبل اُس دن جب آپ نے مجھے گاڑی میں دیکھا میں اپنی منگیتر سے ملنے کے لئے ایگرام جا رہا تھا۔

عورت ـــــ الٰہی توبہ !

مرد ـــــ چنانچہ میری نگاہوں کا قطعاً وہ مطلب نہ تھا جو آپ نے سمجھا - مثلاً جب میں نے آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اُس وقت میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میرا خُسر بھی کیسا تنگ دل، خسیس، سٹھیایا ہُوا کھوسٹ ہے۔ وہ دلہن کو جہیز کا روپیہ نہ دینے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراش رہا تھا - یہ سوچ کر میں تلخی سے مسکرایا لیکن آپ نے یہ خیال کیا کہ میں آپ کے گورے اور نازک ہاتھوں کو دیکھ کر مسکرایا ہوں۔

عورت ـــــ جی ہاں۔

مرد ـــــ رہا یہ سوال کہ میں نے آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کی طرف دیکھا ہی کیوں؛ سو جب کوئی آدمی کسی گہرے خیال میں غرق ہوتا ہے تو وہ عموماً کسی نہ کسی چیز پر ایک بھولا نہ سی ٹکٹکی باندھ لیتا ہے۔ اس وقت مثلاً اگر میں لیمپ کی طرف دیکھنے لگتا تو بھی میرے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اور جب میں آپ کے قدموں کی طرف دیکھ رہا تھا اگر اس وقت میرے بُشرے سے سکون آمیز بے تعلقی ظاہر ہو رہی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اُس وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میرا خُسر اپنی اس ہٹ پر قائم رہا تو پھر ہماری شادی کا سوال ہی خارج از بحث ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ بھلا موجودہ حالت میں ہم شادی کر ہی کس طرح سکتے ہیں۔ اس الجھیڑے سے گھبرا کر میں نے بے خیالی میں آپ پر سر سے پیر تک نظر دوڑائی ہوگی۔ اسی وقت کے قریب آپ کے قول کے مطابق آپ کی نگاہوں نے "آہ!" کہا تھا، لیکن آپ کی "آہ" سے بالکل بے خبر میں اپنے دل میں اپنی منگیتر کے باپ کے پاس جا کر صاف صاف الفاظ میں جہیز کا مطالبہ پیش کر دینے کے امکان پر غور کر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں پورے زور اور وضاحت کے ساتھ اپنا اور اپنی مجوزہ رفیقہ حیات کا معاملہ اس کے سامنے پیش کروں گا۔ مگر یہ فرض مجھے بہت ناگوار معلوم ہؤا۔ اس پر میں نے ایک سرد آہ بھری لیکن پھر سینہ تان کر کہا جو ہو سو ہو یہ ناگوار فرض ادا کرنا ہی پڑے گا۔ یہی موقع ہے جب آپ نے سمجھا کہ میری آنکھیں کہہ رہی ہیں "یہ کیسا ظلم ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے اجنبی رہیں گے۔"

عورت ـــــ میرے اللہ!

مرد ـــــ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں اپنے گہرے سوچ میں ڈوبا ہؤا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اس کے باپ سے کہہ کر بات بھی کھوؤں گا اور نتیجہ بھی کچھ نہ نکلے گا۔ اگر اس کی نیّت ہوتی تو وہ کہے بغیر ہمیں روپیہ دے دیتا۔ چونکہ اس نے از خود ایسا نہیں کیا، اس سے کچھ کہنا بھی لاحاصل ہے۔ اس وقت میری دُکھ بھری نگاہیں آپ پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں آپ کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ یہی وہ نگاہ تھی جس کا مفہوم آپ نے "کبھی نہیں کبھی نہیں" سمجھا تھا۔ ایک طرح آپ درست بھی سمجھی تھیں مگر یہ "کبھی نہیں" جہیز سے تعلق رکھتا تھا۔

عورت ـــــ اُف! غضب!

مرد ـــــ اور جب ہم ایگزام پہنچے اور میں آہ بھر کر پیچھے دیکھے بغیر گاڑی سے اُتر گیا اس وقت میں اس کشمکش و پیچ میں پڑا ہؤا تھا کہ میں ایک ایسی لڑکی سے جسے روپیہ نہ ملے گا کیونکر شادی کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ آپ نے میری اس آہ کو اپنے سے جدا ہونے کے غم و حرماں کا نتیجہ قرار دیا اور پلٹ کر نہ دیکھنے کو میری احترام آمیز پرستش پر محمول کیا۔

عورت ـــــ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا ہے۔

مرد ـــــ شاید مجھے آپ پر یہ باتیں ظاہر نہ کرنی چاہئے تھیں۔ دوسروں کے دل خوش کن تخیلات کا طلسم توڑ دینا اچھا نہیں ہوتا لیکن مجھے یہ بھی جائز معلوم نہ ہؤا کہ آپ کی طرف سے ایسی محبوب یادداشتوں اور محبت آمیز جذبات کو قبول کرتا چلا جاؤں جن کا دراصل میں کسی طرح حقدار نہیں۔ [یہ کہہ کر وہ اپنی نشست پر پیچھے کی طرف ٹیک لگا کر خاطر جمعی کے ساتھ نیم دراز ہو جاتا ہے]

عورت ـــــ تو یہ کتنی دردانگیز حقیقت ہے! تو میرے سپاہی آپ تھے؟

مرد ـــــ جی ہاں! نارنجی زرد کوٹ اور سنہرا پرتلا۔ پلاز سے چڑھا اور اگرام اُترا۔

عورت ـــــ مجھے بہت افسوس ہے۔ میرے سپاہی کی ویسی ہی یاد اچھی تھی جیسی میرے دل میں تھی مگر اب آپ نے اسے تباہ کر دیا ہے۔

مرد ـــــ مجھے خود اس کا افسوس ہے [گاڑی فیوم کے مضافات میں داخل ہو چکی ہے۔ اور غرفے سے وسیع بندرگاہ کا منظر دکھائی دے سکتا ہے]

عورت ـــــ یہ انکشاف بہت یاس انگیز ہے۔ مگر ہم عورتوں کو اس کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ ہم پر یہ حقیقت زندگی میں بار بار روشن ہوتی ہے کہ مرد صرف اُسی وقت محبّت کے قابل ہوتا ہے جب ہم اُسے اپنے خوش آئند تصوّرات کے آئینہ میں منعکس دیکھتے ہیں۔ ہم مرد کے نقوش کو خود آب و رنگ دیتے ہیں اور اُس کے بعد اپنے ہاتھوں کی اس صنعت گری سے والہانہ محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن آخر ایک دن واقعیّت کا دردناک چہرہ ہمیں نظر آجاتا ہے۔ جس حقیقت کا آج آپ نے مجھ پر انکشاف کیا ہے واقعی بہت مایوس کن ہے لیکن میرے دل کو ایک تسلی ضرور ہے۔

مرد ـــــ کیا؟

عورت [دلجمعی سے] ـــــ کہ میری کہانی کا ایک لفظ بھی سچّا نہیں۔

مرد ـــــ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

عورت ـــــ جی ہاں! ایک لفظ بھی درست نہیں۔ یہ تمام قصّہ میں نے خود تراشا ہے۔ پرسوں میں ایبیریا میں اپنے شوہر سے جا ملوں گی۔ اگر آپ وہاں ہوئے تو اُن سے مِل کر اس بات کے متعلق اپنا اطمینان کر سکتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے عمر بھر کبھی فیوم اور بڈاپسٹ کے درمیان سفر نہیں کیا۔

مرد ـــــ اچھا . . . کیا ـــــ

عورت ـــــ آج میں پہلی مرتبہ فیوم میں داخل ہو رہی ہوں اور میرے لفٹننٹ کا افسانہ اوّل سے آخر تک سفید جھوٹ تھا اس سے آپ کو یہ سبق سیکھنا چاہیئے اور کہ لوگوں کے خوشگوار خوابوں کو پریشان کرنے کی کوشش سے پہلے ذرا زیادہ

احتیاط ضروری ہوتی ہے ۔

مرد [کھنکار کر] —— لیکن میں نے احتیاط ہی سے کام لیا تھا آپ کا خیال ہے آپ نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے لیکن حسنِ اتفاق سے آپ کا یہ خیال درست نہیں نکلا [اس نیلے کاغذ کو کھولتا ہے جواب تک اس کے ہاتھ میں تھا] اثنائے گفتگو میں برابر یہ کاغذ میرے ہاتھ میں رہا ہے

عورت —— کاغذ کا اس بات سے کیا تعلق ؟

مرد —— یہ کاغذ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں شروع ہی میں بھانپ گیا تھا کہ آپ کی داستان کو صداقت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں کل بڈاپسٹ سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے بہت سے ضروری فرائض انجام دیئے تھے ہیں نے اسی سلسلے میں اپنا فوجی ٹیکس بھی ادا کیا اور یہ اس کی رسید ہے ۔

عورت —— اچھا تو اس رسید سے مطلب ؟

مرد —— یہ میرے نام پندرہ کرون فوجی ٹیکس کی رسید ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میرا کبھی فوج سے تعلق نہیں رہا ۔ نہ میں کبھی سپاہی بنا ہوں نہ لفٹننٹ اور نہ میں نے کبھی نارنجی حاشیے کی یا کسی اور قسم کی وردی پہنی ہے ۔

عورت [اچپلاہٹ سے] —— تو گویا آپ میرے سامنے جھوٹ کے پُل باندھتے رہے ؟

مرد [زندہ دلی سے] —— جی ہاں یقیناً اور جھوٹ بنانا شروع کرنے سے پہلے میں نے یہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت یہ ثابت ہو سکے کہ میں محض اپنی شخصیت کو دلچسپ بنانے کے لئے جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ میرا مقصد آپ سے اس بات کا اقبال کرانا تھا کہ آپ کے لفٹننٹ کا قصہ بالکل بے سر و پا ہے ۔ اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میں اپنے اس مقصد میں کس طرح کامیاب ہو چکا ہوں

عورت —— تو یہ کاغذ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آپ کبھی فوج میں نہیں رہے ؟

مرد [فتحمندانہ انداز سے] —— قطعی !

عورت —— یہ خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہر چیز ہمارے پاس ہی ہے ۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی، میرا بیگ وہ رکھا ہے ۔ ذرا مجھے دے دیجئے ۔

مرد [بیگ عورت کو دیتے ہوئے] —— یہ بیگ ؟

عورت —— جی ہاں [بیگ کھولتی ہے اور اس میں سے ایک ضخیم کتاب نکال کر اُسے دکھاتی ہے]

عورت —— اس کتاب کا نام تو پڑھیئے ۔ کیا ہے ؟

مرد [پڑھتا ہے] —— "میرا روزنامچہ"

عورت —— میں ہمیشہ اپنا روزنامچہ اس خیال سے اپنے ساتھ رکھتی ہوں کہ کہیں نامطبوع ہاتھوں میں نہ جا پڑے [صفحات پلٹتی

ہے] ۱۸۹۶ . . . . یہ ہے . . . . ہاں . . . . آپ ذرا اس صفحے کی عبارت پڑھیئے۔ اس پر آپ کو لفٹننٹ کی پوری کہانی جیسی میں نے ابھی سنائی ہے لفظ بہ لفظ ملے گی۔

مرد [حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر] —— تو پھر درحقیقت یہ کہانی سچی ہے؟

عورت —— ثبوت آپ کے سامنے موجود ہے۔

مرد [کچھ دیر تک پڑھتا ہے] —— اچھا تو یوں ہے۔ آخر آپ نے مجھے پکڑ لیا، کیوں ہے نا! لیکن تھوڑی دیر قبل آپ اس کی صحت سے انکار کیوں کر رہی تھیں؟

عورت —— بجز اس کے آپ سے اس بات کا اقرار کرانے کی صورت ہی کیا تھی کہ آپ میرے لفٹننٹ نہیں ہیں؟

مرد —— درست!

عورت —— اب دیکھا آپ نے میرے دلکش تصورات کا طلسم اُسی طرح قائم ہے! لیکن ہاں یہ تو بتایئے آپ نے نارنجی گوٹ کا کیونکر سُراغ لگایا؟ میرے روزنامچہ میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرے لفٹننٹ کی وردی واقعی ایسی ہی تھی۔

مرد —— اتفاق سے مجھے یہ معلوم تھا کہ دس سال قبل فیوم میں ایک ایسی پلٹن ٹھہری ہوئی تھی جس کی وردی اس قسم کی تھی۔

عورت —— اوہو! کیسی سیدھی سی بات ہے۔ شکریہ! [گاڑی آہستہ آہستہ سٹیشن میں داخل ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے]

مرد [جاتے ہوئے کھڑا ہو کر] —— اچھا خدا حافظ!

عورت —— رخصت سے پہلے میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ آئندہ کبھی عورت کے تصورات سے کھیلنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ وہ اُن کو قائم رکھنے کے لئے جان لڑا دیتی ہے۔ عورت اپنے دل میں جانتی ہے کہ اس کے تصورات محض خوبصورت جھوٹ ہیں لیکن وہ ایک خوبصورت جھوٹ کی حفاظت کے لئے ہزار بھونڈے جھوٹ بولنے کو بھی تیار ہو سکتی ہے۔ لیجئے خدا حافظ! یہ سفر بہت مزے سے کٹا۔ ورنہ آپ کے بغیر بہت بےلطفی رہتی [سر کے ایک زندہ دلانہ اشارے سے اُسے سلام کرتی ہے اور اپنے اسباب کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے]

ترجمہ
از
حامد علی خاں

غزل

محشر پہ آسرا مجھے دیدار کا ملا
خوش ہوں کہ یہ عذاب مسرت نما ملا

لطفِ نیاز جُھک کے سرِ نقشِ پا ملا
سجدہ خود اپنے مرکزِ اصلی سے جا ملا

سودائے عشق وحشتِ دل سوزشِ فراق
جو درد بھی ملا وہ مجھے لا دوا ملا

میں نے تو پا لیا تجھے اُن کے جمال میں
میرا بھی بیخودی کہیں تجھ کو پتا ملا

ہر جزو اپنے کُل کا نمائندہ بن گیا
یعنی خدا نُما مجھے ہر خود نُما ملا

سجدہ جو غیرِ ذاتِ خدا عین کفر تھا
وہ مذہبِ جنونِ طلب میں روا ملا

نکلی بھی میری جان تو قدموں سے تیرے دُور
یہ تیرِ بے خطا بھی مجھے نارسا ملا

شاید تمہاری پہلی نظر سے مراد ہو
وہ ابتدا کہ جس میں غمِ انتہا ملا

ہر یاس کی نظر پہ تڑپتے رہے وہ ابرؔ
ہر نالۂ خموش ہمارا رسا ملا

ابرؔ احسنی

اظہار

کبھی اپنی محبّت کا ذکر کرنے کی خواہش نہ کر
کہ محبّت کا تو کبھی ذکر ہو ہی نہیں سکتا
دیکھ نسیمِ سحر کس قدر خاموشی سے
کس طرح نظروں سے اوجھل ہو کر چلتی ہے۔

میں نے اپنی محبت کا ذکر کر دیا، ذکر کر دیا
میں نے اپنی محبوبہ کو اپنے دل کی سبھی باتیں بتا دیں
کانپتے ہوئے سخت ڈرتے ہوئے
آہ وہ چل دی!

وہ مجھے چھوڑ کے گئی تھی
کہ ایک مسافر پاس سے گزرا
خاموشی سے سب کی نظروں سے اوجھل،
اُس نے ایک آہ بھری اور وہ اُسے لے کر روانہ ہوگیا۔

گلچیں

آنکھیں روشن ہونے لگیں

کوئی جسے کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا
درختوں میں شمعیں روشن کر رہا ہے۔

جیسے تارے ایک ایک کر کے نکلیں بس اُسی طرح
ہر شاخ پر یہ شمعیں ایک ایک کر کے جلنے لگیں۔

چُپ چاپ سارے کے سارے جنگل میں
دو دو آنکھیں روشن ہونے لگیں باری باری۔

ریشمی چھچھوندریں اور مخملیں چُوہے
ایسی تیز آنکھیں رکھتے ہیں جیسے برف کے شگاف۔

اُلّوؤں کی سیاہ سی لالٹینیں
تاباں ہوئیں زمرّدیں گناہ کی طرح۔

چیتا زرق برق چیتا
اپنی آتش دماغ کی چمک کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہے۔

بگلے زمانے کی طرح خاموش کھڑے ہیں
اور اپنے آنسوؤں کے اندر سے دیکھتے ہیں مچھلیوں کو تیرتے ہوئے۔

رات کی تمام مخلوق
آپ اپنی روشنی بن رہی ہے!

گلچیں

رادھا کا ایک گیت

سکھی
میں صبح باغ میں گئی
پریتم کو ڈھونڈنے
پھولوں کی گمبھیر گپھا میں

اوس کی بھیگی ہوئی بوندوں نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا
"پریم رات کے سپنوں کے ساتھ ہی چلا جایا کرتا ہے!"
آخری ستاروں کی بجھی ہوئی کرنوں نے، مجھ سے صرف اتنا ہی کہا
"پریم صبح کے اجالے میں دکھائی نہیں دیتا!"
سکھی
میں صبح باغ میں گئی
پریتم کو ڈھونڈنے
پھولوں کی گمبھیر گپھا میں

. . . .

عظیم قریشی لدھیانوی

قطرۂ شبنم

(شاعر)

گلشن میں ایک قطرۂ شبنم سے صبحدم
میں نے کہا تو آئینۂ نوبہار ہے

پڑتا ہے تجھ میں عکس حسینانِ باغ کا
دامن ترا بہشت صفت پُرنگار ہے

چہرے میں تیرے اشک محبت کی دلبری
جلوے میں آب و تابِ دُرِ شاہوار ہے

مستی تری ہے غیرتِ پیمانۂ شراب
ہشیار مثلِ اخترِ شب زندہ دار ہے

موتی ہے یا ستارہ ہے یا اشک جانفروز
پیکر سے تیرا گوہر پاک آشکار ہے

دامن چھڑا رہا ہے جوانانِ باغ سے
کن گلرخوں کے شوق میں یوں بیقرار ہے؛

یہ مہرِ آفتاب ہے یا جورِ آفتاب
تیغ شعاعِ نور سے تو دل فگار ہے!

ہے نورِ آفتابِ سحر تجھ کو پیکِ موت
تو نورِ آفتابِ سحر کا شکار ہے

کھوتا ہے تیغ نور سے ہستی کی آب تو
کرتا ہے شکوۂ ستمِ آفتاب تو

(شبنم)

ظاہر مرا ہے قطرۂ ناچیز شبنمی
باطن نیامِ خنجرِ آئینہ فام ہے

خنجر مرا ہے جذبۂ شوقِ وصالِ دوست
وہ دوست جس کا عرشِ بریں پر مقام ہے

روشن ہے اس کے حسن سے یہ بزم کائنات
ان ظلمتوں کی شمع وہ ماہِ تمام ہے

رہتی ہے میری روح کو رفعت کی آرزو
روحِ حیات آہوئے گردوں خرام ہے

عشاق کی نگہ ہے فلک پر لگی ہوئی
عشاق پر محبتِ دنیا حرام ہے

سمجھا ہے آفتابِ سحر کو تو پیکِ موت
یہ آفتاب دوست کا زریں پیام ہے

ہوں دوشِ آفتابِ سحر پر سوار میں
جاتا ہوں بزمِ دوست میں دیوانہ وار میں

محمد اکبر منیر

U966

مصیبت کی گھڑیاں

(۱)

شاید یہ تو میں نہ بتاسکوں کہ وحشت کی کتنی قسمیں ہیں، ہاں! اتنا ضرور کہوں گا، کہ میری وحشتوں کا بھی شمار نہیں، ابتک کس کس طرح کی وحشتیں مجھے اُٹھیں اور آئندہ کیسی کیسی اُٹھنے والی ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اگر میں اپنی گزشتہ وحشتوں کے بیان پر آؤں تو سُننے والے کانوں پر ہاتھ دھریں، اور نہ جانے کہاں تک نوبت پہنچے، لہذا فی الحال فقط ایک ادنیٰ اسی وحشت کا ذکر کئے دیتا ہوں۔

اٹھائیسویں جنوری ۱۹۳۵ء بروز دوشنبہ بمقام مگرورہ[1] فورٹ راو لوک پال سنگھ صاحب چتر کار (آرٹسٹ) میرے ایک قصیدہ پر رنگین حاشیہ کھینچ رہے تھے، وہ جو کچھ دیر مصروفِ گلکاری رہے، تو یہاں بے ارادہ کسی قدر دم سا گھٹنے لگا آہستہ آہستہ اندر والے نے رنگ بدلنے شروع کئے، ــــ

جس طرح اسٹارٹ ہوتے وقت، پہلے مشین کے کل پُرزے گڑبڑ مچاتے ہیں، پھر بھڑ بھڑ کر کے سارا کارخانہ تھرتھراتا ہے، اور دس بیس قدم جھپٹا سا مار کر، ہوائی جہاز زمین چھوڑ فضائے آسمانی میں فرّاٹے بھرنے لگتا ہے۔

کچھ نامعلوم سی حالت سے ایک سلسلہ جنبانی ہوئی جو ہر سانس پر ترقی کرتی گئی، رنگارنگ مناظر ذہن میں پھرے مختلف النوع جذبات کے ناقابلِ بیان اثر سے وحشت نے کروٹ بدلی، حتّےٰ کہ مجھ پر بدحواسی چھاگئی۔

اب کہ اس ہیجانی ضیق سے چھٹکارے کی صُورت نظر نہ آتی تھی، یکایک ڈبرا[2] جانے کی سُوجھی، بس جناب! پھر کیا تھا، وہ طوفان پوری قوّت سے اسی نقطہ پر آٹھہرا۔

اچانک جال میں پھنس جانے والے پرند کی مانند میرا دل پھڑکنے لگا، یہ کیفیت ہوئی کہ پر لگا کر اُڑ جاؤں ڈبرا کو۔

چُپکے سے اُٹھ کر میں نے کوٹ پہنا، اور ڈنڈا سنبھالا، ادھر پائی جو آہٹ راو صاحب نے، فوراً نظر اُٹھائی اور گلاس

[1] ریاست گوالیار کی ایک جاگیر۔ [2] گوالیار سے جھانسی کے رُخ جی۔ آئی۔ پی۔ آر کا چوتھا اسٹیشن۔

میں بُرش ڈال کر تعجب سے پُوچھا :۔

کیوں ؟

میں ۔ ڈبرا ہو آؤں ذرا !

وہ ۔ ایسا کیا کام ہے ؟

میں ۔ یوں ہی، ایک آدھ بنڈل لینے بیڑی کا۔

وہ ۔ نہیں رہیں کیا ؟

میں ۔ جی . . . . . . ہیں تو . . . . مگر . . . . کل تک ختم ہو جائینگی۔

وہ ۔ (مسکرا کر) خیر کل کا اللہ مالک ہے، ہم منگا دیں گے صبح ہی صبح۔

میں ۔ (قدرے تامّل کرکے) بیشک منگا دیں گے آپ . . . لیکن ذرا ہو ہی آؤں تو اچھا ہے۔

وہ ۔ خواہ مخواہ . . . . . پریشان ہونے کی کیا ضرورت . . . . . اب ڈبرا اوبرا جانے کا وقت نہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ دن رہ گیا ہے، اندھیری راتیں، موسم خراب، راستہ بے ڈھنگا . . . کہیں بھُول بھال گئے تو دِقّت ہوگی۔

میں ۔ خوب ! راستہ بھولنے کی بھی ایک ہی رہی، اجی جناب ! بارہا آیا گیا ہوں، چھ میل ہوتے ہی کیا ہیں، گیا کہ آیا، چٹکی بجاتے یہیں دیکھ لیجئے۔

وہ ۔ اچھا ! ہم اسی وقت آدمی بھیجے دیتے ہیں، کیوں صاحب !! اب تو ہے ؟

میں ۔ جناب من ! تکلف کی کیا ضرورت میں خود ہی جو لئے آتا ہوں۔

وہ ۔ اُفّوہ ! آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اجی صاحب ذرا دَم تو لیجئے . . . . ٹھہریئے . . . . . یہی مرضی ہے تو خیر کسی آدمی کو ساتھ لیتے جائیے !!

جوں جوں وہ اصرار کرتے تھے میرا حال غیر ہُوا جاتا تھا، جب اُنھوں نے "کسی" کی بیخ لگائی، تو مجھے سخت صدمہ ہُوا، یہ سمجھ میں آیا کہ میں ایک ایسا نظر بند قیدی ہوگیا ہوں، جو مقررہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، اور اس شبانہ روز کی نگرانی سے بیچارہ ناگفتہ بہ اُلجھن میں گرفتار ہے۔

دِق آکر بولا :۔

"معاف کیجئے گا ! آپ ناحق دیر میں دیر لگا رہے ہیں، ابتک تو میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا"۔

دو ایک بار اُنھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا، دیرینہ کرم فرما ہونے کی وجہ سے وہ میری طینت جانتے ہیں، صاف تاڑ

گئے۔ کیا؟

یہ خبطی اس حرکت سے باز آنے والا نہیں، اگر صرف بیڑیاں ہی چاہئیں تو اتنے آدمی موجود ہیں، ابھی منگا دی جائیں، مگر نہیں صاحب یہ تو ایک بہانہ ہے، در اصل اسے اُڑ رہی ہے" وحشت" اب یہ ماننے کا تھوڑا ہی، ایسے کو سمجھانا فضول ہے، ہٹاؤ جھگڑا، یہ جانے اس کا کام جانے۔

مکرم راؤ صاحب نے آخر عاجز آ کر خاموشی اختیار کر لی، اور بدستور گل بوٹوں میں رنگ بھرنے لگے۔

(۲)

راؤ صاحب کا سکوت فرمانا، اور میری چھٹی ہونا، اُدھر اُنہوں نے سر جھکایا اِدھر میں کھسکا، جلد جلد کمرے کی سیڑھیاں اُتر، قلعہ کے پھاٹک باہر، جھٹ پٹ پہاڑی اُتار ختم کیا اور بستی کے سرے کی ڈبرا کا کچا راستہ کاٹنے والی گڑواٹ[1] طے کر کے، نون[2] ندی کے بھرکے[3] الانگتا پھلانگتا کھیتوں، مینڈوں، ڈانڈوں اور راستے میں ملنے والی گڑواٹوں پگڈنڈیوں سے گذرتا، وہاں جا پہنچا، جہاں سے جی۔ آئی۔ پی۔ آر کا سگنل دکھائی دیتا ہے، کچھ دُور اور چلا ہوں گا، اونچے اونچے درختوں میں ڈبرا کی علامتیں جھلکنے لگیں، اس طرح کوئی پون ایک گھنٹے میں وہ آبادی آ گئی۔

گوشرگ باشی مہاراجہ عالیجاہ بہادر سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا کے عہد میں منڈی قائم ہو جانے کی وجہ سے یہاں ایک چھوٹا سا بازار بن گیا ہے، پچھور[4] اور بہرسی[5] جانے والی لاریاں صبح و شام گزرتی ہیں، ریلوے اسٹیشن پر بھی آمد و رفت رہتی ہے، تاہم اس مختصر آبادی میں بڑے بڑے قصبوں یا شہروں کی سی چہل پہل کہاں۔

علاوہ ازیں نہ تو اس جگہ میرا کوئی دوست آشنا جس سے جی بہلتا، اور نہ اِن گنتی کی دکانوں وغیرہ کے سامنے خواہ مخواہ چکر کاٹتے پھرنا ہی کچھ دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا، طرہ یہ کہ رات سر پر آ گئی۔ بادل لدا کھڑا، برساتی یا چھتری وتری بھی پاس نہیں، جنگل کا راستہ، دُور جانا، ان قباحتوں کے لحاظ سے وقت ضائع کرنا بے فائدہ معلوم ہوا، گاجر کا حلوا بنانے کی صلاح تھی، چلتے وقت ایک تھیلی لیتا آیا تھا، روپیہ کی کانپوری شکر کے دو پڑے بنا کر تھیلی میں ڈالے، تنبولی سے تین بکس دیا سلائی کے، اور پان بیڑی لے کر اُلٹے پیروں پھرنے کی ٹھہرائی۔

---

[1] گاڑی چھکڑوں کا کچا راستہ۔ [2] اسی علاقہ کے پہاڑوں سے نکل کر سندھ ندی میں جا گرتی ہے۔ [3] کھاڑیں۔ دریاؤں کے قریب کی ٹیلوں کراڑوں سے معمور زمین جو معاون نالیوں نالوں کے بہاؤ سے کٹ کٹ کر سخت ناہموار ہو جاتی ہے۔ [4] ضلع گرد گوالیار کی ایک تحصیل۔ [5] راجہ نل والی اجدھانی سے سات آٹھ میل تحصیل آرون ریاست گوالیار کا ایک موضع، جہاں پاربتی ندی پر مٹی کا اتنا بڑا بند باندھا گیا ہے جس سے تخمیناً سات سَو مربع میل آبپاشی کی جا سکے گی۔

ایک تو آج وَیسے ہی صبح سے مطلع ابر آلُود تھا، اس پر اب اور بھی زور شور سے کالے کالے بادل اُمنڈنے شروع ہوئے۔ وہ گھٹا چھائی، معلوم ہُوا کوئی دم میں موسلا دھار برستا ہے، اور ندی نالے ایک ہوتے ہیں۔

قصہ کوتاہ میں گھبرا کر ریلوے کے پھاٹک باہر ہُوا، ہرسی اور اسٹیشن کی سڑکوں کے جوڑ پر آ کر مگرورہ فورٹ کے پہاڑ کی شست باندھی، اور اُس سمت بے راستہ دھاوا بول دیا۔

جس وقت تیز ہوا کے جھونکوں میں اُڑا جا رہا تھا، تو میں نے جا بجا ٹھوکریں کھائیں، جھاڑ جھنکاڑوں میں اُلجھا، مگر کچھ پروا نہ کی، کبھی ڈلکی ہُوا، کبھی دوڑ لگائی، یہ کھائی پھاندا، وہ باڑ کُودا، واللہ اعلم کتنے بنجر، اوندھیں، کلر، مینڈیں، سرپتے، جھُوکٹے پس پشت چھوڑے، پھر جو نظر اُٹھائی تو "ہنوز مگرورہ فورٹ دُور است" والا مضمون ہے، دم بدم تاریکی بڑھتی جاتی تھی، حتےٰ کہ نون ندی کے بھرٹکوں تک پہنچتے پہنچتے بینائی عاجز رہ گئی، اور مجھ بے یار و مددگار کو مہیب اندھیرے نے گھیر لیا۔

(۳)

اب سوائے بھرٹکوں کے کوئی پگڈنڈی تھی نہ گرد واٹ، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے پر بمشکل ایک مٹی مٹی سی لیکھ ملی، غنیمت جان کر میں نے وہی اختیار کی۔

خیال فرمائیے! بھرٹکوں کی لیکھیں کیسی بھُول بھلیاں ہوتی ہیں، جن کے اعتبار پر انسان دن میں کہیں کا کہیں جا پڑتا ہے، چہ جائیکہ ایسی رات جو تاریکی تربت کو شرمندہ کر رہی تھی، کیا نتیجہ نکلتا؟

وہی، جس کے خوف سے راو صاحب مجھے روک رہے تھے، آہ! گمراہ کُن لیکھ نے ایک ایسی جگہ جا نکالا، جہاں گھنی جھاڑی سدِ راہ تھی۔

ڈنڈا ٹیک ٹیک کر راستہ ڈھونڈتا پھرتا تھا، یکایک اس زور سے بادل گرجا، وہ بجلی کڑکی، گویا صور پھُنکا، زمین آسمان اُڑ گئے، اور میری روح قالب سے پرواز کر کے کسی اور ہی عالم میں منتقل ہو گئی۔

یہ اضطراری حالت چند سیکنڈ سے زیادہ قائم نہ رہی، دم زدن میں بجز ہیبت ناک سکوت اور ڈراؤنی تاریکی کے کچھ نہ تھا، کسی قدر سکون ہونے پر میرے پیروں کو جنبش ہوئی، اور میں نے مضبوط عزم سے جستجو شروع کر دی۔

بہت سے اُتار چڑھاؤ طے کر کے ایک بلند کراڑے پر پہنچا، اور اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا، اس تگ و دو میں کتنی ہی لیکھیں ملیں، جو زیادہ تر مویشیوں کے کھروں سے بن گئی تھیں، ان میں کوئی ایسی نہ تھی جو مجھے رستے لگا دیتی۔

ابھی ویسی ہی سرگرمی جاری تھی، کہ پھُئیوں پھُئیوں مہاوٹ پڑنے لگی، سخت گھبراہٹ اُٹھی، آہ! کیسا کیسا چھپٹتا ہوں، کوئی جائے پنا[۱]
نظر نہ آئی، جب یقین ہوگیا کہ یہ بادل بغیر برسے اوپر ہی اوپر نکل جانے والا نہیں، تو ہارے درجے میں نے ایک چھدرے چھدرے
سے ٹھینکر[۲] کی آڑ پکڑی، اس وہم میں کہ ذرا تھمے تو آگے بڑھوں۔

کافی دیر ہوگئی، بار بار ہاتھ پھیلا پھیلا کر دیکھا، ترشح میں فرق نہ آیا، دس پانچ منٹ اور وقت کاٹا، جب بالکل ہی جی نہ لگا،
تو سوچا :۔

بھئی! اب سُوکھے تو جا نہیں سکتے، پھر یوں آہستہ آہستہ بھیگنے سے کیا حاصل، ہم تو جانے..... اب ..... چلنا ہی چاہیے۔
اس وقت جلد جلد بجلی چمکنے سے کبھی زمین جھلکتی تھی، کبھی اندھیرا گھُپ ہوکر کچھ نہ سوجھتا تھا، اور میں اندھا دُھند چلا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ بادل گڑگڑا کر جو بجلی کوندی، تو کوئی دو تین کراڑوں کے اُس پار ویسا چوڑا چوڑا گھرا راستہ نظر آیا، جیسا مگورہ سے
نکل کر ڈبرا جاتے وقت ملا کرتا تھا، جی خوش ہوگیا، کہ چلو شکر ہے، اب منزلِ مقصود کچھ دُور نہیں۔

اوّل تو اتنی بوندا باندی سے زمین گیلی ہوچکی تھی، کہ پیر نہ جمتا تھا، دوسرے بھرٹے کے کچھ ایسے اُوٹ پٹانگ، جن کی نہ کوئی خاص
سمت تھی، اور ایک سا اُتار چڑھاؤ، بالشت بالشت پر ٹھوکریں کھاتا، جابجا رُکتا تھمتا، ڈنڈے کی مدد سے بدقّت تمام اُس چوڑے
راستہ کے اوپر تک جا سکا۔

یہاں آکر جو دیکھتا ہوں، تو کراڑا بالکل سیدھا، ..... یا اللہ اب کیا کروں، کیسے اُتروں ..... مارے اندھیرے کے
ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا، ایسے میں کہیں پھسلا پاؤں تو کہاں کا گور و کفن، نہ جانے کب تک کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، .... مگر یوں ہی کھڑے
کھڑے کیا بنے گا، پلکوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، یہاں سے ہوگا مگورہ شاید کوئی ڈھائی تین فرلانگ، بہرحال کوشش فرض ہے۔

سوچ رہا تھا، کون سا رُخ اختیار کیا جائے، کوندی جو بجلی فوراً سر گھمایا، لیکن افسوس! کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے اندھیرا تھا،
اور گویا آسمان کی بیٹری ختم ہوگئی، مارے گرج کے آپس میں پہاڑ سے ٹکراتے معلوم ہوتے ہیں، مگر صاحب بجلی ہے کوندنے ہی میں نہیں آتی،
بس لمحہ بہ لمحہ پانی زور پکڑتا جاتا ہے۔

کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہ کر میں نے رساں رساں چلنا شروع کیا، یوں ہی اٹکل پچّو جا رہا تھا، کہ ہوا جو پیر پھسلنے کو، اور جونہی

---

[۱] سردیوں کی بارش

[۲] ببول کی سی پتیوں والا خاردار درخت، جس کی دسہرے میں پوجا کی جاتی ہے۔

میں نے ڈنڈا اٹکایا، اندازہ غلط ہونے کی وجہ سے دوسرکا، پھر جناب! سیدھا گھٹنا نشیب میں، اُلٹے پاؤں کا زاویہ قائمہ بنا ہُوا، شکر کی تھیلی پیٹ کے نیچے، اور مُنہ میرا ایک ٹھُنٹھ پر۔

اُٹھتے اُٹھتے چمکتی ہے جو بجلی، تو ارے غضب! خیر گذری، جو کہیں ذرا سا وزن جُھک جائے، تو ڈنڈے کے ہاتھ کسی درندے کا پُرانا بھٹ سا تھا، بزرگوں کا لیا دیا آڑے آگیا، ورنہ پوری پوری گت بنتی۔

سانس روک، بدن سادھ، ساتھ ترکیب کے اُٹھا، اور ہوش حواس درست کرکے وہاں سے روانہ ہُوا، شکر ہے کوئی دس بارہ قدم پر چڑھے راستہ کا اُتار آیا، لیکن نہایت ڈھال، بلا کی پھسلن، تاہم ڈھارس بندھی کہ مار لیا ہے میدان، خدا نے چاہا یہ مشکل بھی آسان ہوئی جاتی ہے۔

ایسے میں تھیلی نہ ہوتی تو مزا رہتا، اب اسے سنبھالوں یا اپنی جان، پھر بھی ہمت کرکے آگے بڑھا، مارے بیتابی کے دل نکلا سا پڑتا تھا، کہ ہائے کب راستہ تک پہنچوں، اور کب پاپ کٹے۔

آخر ڈنڈا ٹیک ٹیک کر جھاڑیوں کے سہارے اُترنے لگا، ابھی آدھی دُور بھی نہ گیا تھا، کہ صاحب پاؤں پھسلا، پھر بد حواسانہ کوشش کے باوجود وہ دھڑام سے گرا، کل کل درست ہو گئی۔

اُوسان ٹھکانے نہ آئے تھے، تھیلی جو ہاتھ سے چھوٹ پڑی تھی جھاڑیوں میں اُلجھتی، میرے مُنہ کے پاس ہوتی ہوئی، بھد سے کیچڑ میں گری۔ پچھاڑ تو ایسی کھائی تھی کہ ایک دفعہ کو تاڑی کھُل گئی، مگر راستہ پا جانے کی خوشی میں یہ مزہ آیا گویا کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کیا، جھٹ پٹ تھیلی اُٹھا، میں نے طرارہ بھرا، بلا پس و پیش اُڑا چلا گیا، اور نہ جانے کہاں جا کر دم لیتا، واللہ اعلم کیوں خیال آیا، کہ ہائیں! یہ تو کچھ نئی سی جگہ معلوم ہوتی ہے، یا تو میں دوسرے راستہ پر ہوں، یا شاید رُخ بدل گیا، ورنہ اب تک ضرور بستی کے آثار ظاہر ہونے چاہئے تھے۔

اب وہ برق رفتاری کہاں، صاحب! پیروں کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں، فکر دامنگیر ہوئی، کسی اُونچے کراڑے پر چڑھ کر جانچنا چاہئے، کہ آخر ہوں کہاں؟

وہاں تو خیر پاؤں پھسل کر ایک پچھاڑ میں کام چل گیا تھا، لیکن جناب! چڑھائی کا معاملہ ٹھہرا اور یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، بعض مقامات ایسے ملے جن سے اُوپر جا سکتا تھا، مگر کب؟ دن میں!

کیوں؟

اِن کے اِدھر اُدھر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، صاف بات ہے اندھیرے میں جرأت نہ ہوئی، دو ایک بار جی کڑا کرکے چاہا بھی پھر ہچکچا ہچکچا کر رہ گیا۔

خیر! لڑھکتا لڑھکاتا کچھ اور چلا، جیسی چاہیئے ویسی صاف جگہ کہیں نہ ملی، اب کہاں تک احتیاط برتتا، آخر توکل بخدا ایک طرف رجوع
ہُوا، اور اوپر چڑھنے لگا۔

مارے پھسلن کے دُھکر پُھکر ہو رہی تھی، اب قلابازی کھائی، اب قلابازی کھائی، خدا خدا کرکے اس کٹان کی چوٹی آئی، جو
کچھ ایسی زیادہ بلند نہ تھی، آگے بڑھا تو پھر ڈھال، اُسے طے کرکے ہنیسوں کے بازو سے نکل کر دوسرے کراڑے پر گیا، اس کا اُتار ختم ہُوا تو
وہ بے ڈھنگا قطعہ آیا جہاں جھاڑی بوٹیوں نے بے حد دق کیا، کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، ہر قدم پر سہ

کہتے تھے خار تھام کے دامن "کہاں چلے"!

اسی طرح سلسلہ وار کتنی ہی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اونچے کراڑے تک رسائی ہوئی۔

اب آنکھیں مل مل کر ہر طرف دیکھتا ہوں، اور کچھ نہیں سُوجھتا، جب عقل کام نہ دے تو کیونکر قدم اُٹھے۔

کھڑے کھڑے دم گھٹنے لگا، جی اُکتا گیا، بڑی دیر بعد بجلی کوندی، مگر کوئی اندازہ لگانے کی مُہلت نہ ملی، پھر کوندی پہاڑ وہاڑ
مطلق نظر نہ آیا، بار بار کوشش کی کچھ حصول نہ ہُوا۔

ہمہ تن چشم انتظار تھا، ناگہاں جیسے بڑے بڑے پہاڑ چھوٹا پہاڑ لُڑھکے، یا شورِ قیامت اُٹھے، فلک الافلاک میں ہلچل پڑی، اِکدم پلٹ کر
میں نے اس طُور بردامان سمت پر آنکھیں لگا دیں، اب جو بجلی کڑکی تو پرجلال گرج میں کروٹیں سی بدلتی ہوئی، اُفق میں رُوپوش ہونے
سے پہلے سمجھا گئی :۔ نادان! مارے جلدبازی کے تُو نے مخالف سمت دوڑ لگا کر خود کو مگرورہ سے دُور پھینک دیا!!

(۴)

کاش! راستہ مِل جانے کی خوشی میں بھول نہ جاتا، ذرا سمجھ بوجھ کر چلتا تو یہ اُفتاد کاہے کو پڑتی۔

آہ! اس قدر نزدیک پہنچ کر بھٹک جانا اکھرا تو بہت، لیکن اب چارہ بھی کیا تھا، ٹوٹتے دل کو سنبھالا، اور مستقل مزاجی سے مگرورہ
کا عزم کیا۔ یہاں بھی بھُولا یعنی میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا، جس پر اُلٹا چل کر ابھی پلٹا تھا، اس خیال سے کہ کون بار بار جھاڑیوں میں اُلجھے،
یا پھسل پھسل کر پچھاڑیں کھائے، بجائے نیچے اُتر کر سیدھے رستے جانے کے لگا اوپر ہی اوپر چلنے، اس طرح اصل راستے سے دُور جا پڑا،
اور کوئی نئی راہ بھی نہ ملی، گویا میں نے ایک مصیبت سے رہائی پاکر خود کو دُوسری اُلجھنوں میں گرفتار کر لیا۔

اس اثنا میں پانی کا زور دھیما پڑ گیا تھا، یوں ہی کچھ بوندا باندی سی ہو رہی تھی، اور اتنی دوڑ جھپٹ سے میرا بگڑتا بھی کیا، ان
ناکامیوں نے مجھے کچھ ایسا دلِ شکستہ نہ کیا، کہ سکت نہ رہتی، لہٰذا نہایت تن دہی سے تگ و دو میں لگا رہا۔

کبھی چڑھاؤ آیا کبھی اُتار، کسی جگہ گھنی جھاڑیاں ملیں، کہیں گہرا غار کہ سرک پڑوں تو تلے تک پہنچتے پہنچتے خار دار جھاڑیاں

کپڑوں سمیت جسم کو چھلنی کر دیں، ناقابل گذار مقامات آ جانے کی وجہ سے اکثر پلٹنا بھی پڑا لیکن نامرادی تھی کہ دُور نہ ہوئی اور آئندہ کی اُمید بھی نہ بندھی، تو سخت تاؤ آیا، بڑی جھنجھلاہٹ اُٹھی، کہ توبہ! کیا آفت ہے، "گر قہر درویش بجانِ درویش" امر مجبوری کرتا بھی تو کیا کرتا، ہار جھک مار کر وہی جدّ و جہد جاری رکھنی پڑی۔

اچھی طرح نڈھال ہو جانے کے بعد ایک میدان سا آیا، یہاں سُوجھی کہ جھڑکوں کی سرگردانی فضول ہے، ان کا اور نہ چھور، اب ذرا باہر نکل کر جستجو کریں۔

میدان میں آنا اور جیسے یہی انتظار تھا، تڑا تڑ تڑا تڑ یہ بڑی بڑی بوندیں پڑنی شروع ہوئیں، اور لگی جلد جلد بجلی کوندنے، گویا فرشتے آتش بازی سے کھیل رہے ہیں، یہ سماں تھا کہ آسمان میں آگ لگی اور زمین پر طوفانِ نوح آ گیا۔

اِدھر بھاگا، اُدھر دوڑا، کہ بھئی! ذرا کوئی درخت ورخت ملے تو اس موسلا دھار سے کچھ بچاؤ ہو، مگر توبہ صاحب! کہیں ایسے موقعوں پر دُعا قبول ہوتی ہے۔

جس طرح کوئی تھکا ماندہ ملاح جوار بھاٹے سے لڑتا، تہ و بالا کر دینے والی موجوں کا ستا لبِ ساحل آ پہنچے، کہ اچانک بندرگاہ کے پُشتے سے ٹکرا کر اس کی کشتی دوبارہ طوفان میں جا پڑے، اس پر بروقت چپّو کا ڈانڈ ٹوٹ جانے کے باعث وہ برگشتہ نصیب مایوسی کی لمبی سانس کھینچ کر سُن ہو جائے، جب میں نے کہیں ٹھکانا نہ پایا تو ایک کریل کے نیچے بیٹھ کر رہ گیا۔

اس مصیبت میں چاہئے تو یہ تھا، کہ میرے حالِ زار پر رحم کیا جاتا، لیکن ایک خطاکار بندے کی حمایت میں مشیّت نے وہ بے شمار مصلحتیں نظر انداز نہ کیں، جن سے نہ معلوم کون کون سے ناقابلِ فہم اسرار وابستہ ہوں گے۔

آہ! میری آرزو کے خلاف بادل چھٹ کر تارے نکل آنے کے بجائے جھڑی بندھ گئی۔

ٹوپی تو میں نے پناہ لینے سے پہلے ہی بغل میں مار لی تھی، اب جو بارش میں زیادتی دیکھی، اور بظاہر اسباب کھلنے کے آثار نہ پائے، تو راضی برضا ہو کر بیٹھے بیٹھے آستینوں میں سے ہاتھ نکال روئی بھرا کوٹ سر پر ڈال لیا، کہ کچھ نہ کچھ تو حفاظت ہوگی۔

جیسا اُمنڈ گھمنڈ کر آیا تھا، ویسا ہی ڈٹ ڈٹ کر برسا، دم بھر میں میرے سامنے تقریباً کوئی تین ساڑھے تین ہاتھ چوڑائی میں، تیزی سے ایک نالہ سا بہنے لگا۔

اُلٹے ہاتھ میں شکر کی تھیلی لٹکائے سیدھے سے ڈنڈا تھامے، گاڑی کے ترپال کی طرح لحافی کوٹ اوپر ڈالے یونہی بنا سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا، بجلی جو کوندی تو پیروں کے بیچوں بیچ میں، نالے کے رُخ سانپ سا لہراتا دکھائی دیا۔

قریب تھا کہ قلانچ بھر کے کیچڑ میں لت پت ہو جاؤں، معاً تین چار جگہ بجلیاں کوند گئیں اور روشن ہوا:۔

اُفوہ! سانپ وانپ نہیں، نشیب کی وجہ سے پانی کا ریلا چلا آ رہا ہے!

مرزا فہیم بیگ چغتائی

دخترِ مشرق

اُفقِ صبح ہے ہمرنگِ سیاہی شاید!
کہیں نزدیک ہے طوفانِ تباہی شاید!

شمعِ احساس سیہ پوش ہوئی جاتی ہے
تپشِ زیست بھی خاموش ہوئی جاتی ہے
زندگی، دردِ فراموش ہوئی جاتی ہے
کچھ نہیں ---- چارۂ افسردہ نگاہی شاید!

کر دیا دفن کہاں ذوقِ حیاداری کو!
زندہ رکھتی ہے جو قوموں کو وہ غیرت ہی نہیں
وہ حمیت، وہ شجاعت، وہ جلالت ہی نہیں
آہ! خونِ رگِ مشرق میں حرارت ہی نہیں
خود فروشی نے مٹایا غمِ ناداری کو
بے وفا بیچتے پھرتے ہیں وفاداری کو

ہو اگر عصمتِ جذبات کا خوں ہوتا ہے
اب تو نیکی کے تصور سے جنوں ہوتا ہے
نہ مصائب سے غرض ہے نہ کچھ آلام سے کام
میکشِ ہند کو ہے دورِ مے و جام سے کام
سچ تو ہے، بندۂ آلام کو آرام سے کام
فکر سے حالِ دلِ زار زبوں ہوتا ہے

اب تو دیکھی نہیں جاتی ہے یہ حالت افسوس!
کچھ نہیں منزلِ مقصود غلامی کے سوا
پاس کچھ بھی نہیں موجود غلامی کے سوا
جیسے کوئی نہیں معبود غلامی کے سوا
یوں کوئی قوم ہو، آسودۂ ذلت افسوس!
یوں لُٹے، دولتِ آزادیٔ ملت افسوس!

پاسِ غیرت ہے نہ احساسِ وفا باقی ہے!
ارضِ مشرق! تری تخریب میں کیا باقی ہے!
زیست تو زیست ہے مرنے کا سہارا نہ رہا
رہِ عظمت سے گذرنے کا سہارا نہ رہا
آہ! کوئی بھی اُبھرنے کا سہارا نہ رہا
دُخترِ مشرق! مگر اک تری دُعا باقی ہے

تیرا ایثار، یہ اعجاز دکھا دے اے کاش!
اور ——— تجھکو ہی یہ توفیق خدا دے اے کاش!
دلِ نازک کو ترے درد بھرا پاتا ہوں
تجھ میں اک غیرتِ ملّی کی ادا پاتا ہوں
تیرے احساس کو بیدارِ وفا پاتا ہوں
تُو ہی اِس ملتِ خفتہ کو جگا دے اے کاش!

روشؔن صدیقی

عناصرِ شعر

قافیہ اندیشم و دلدارِ من
گویدم مندیش جز دیدارِ من (رُومی رح)

"سخن" اور "سخنور" کے لئے غالباً دنیا کی کسی زبان میں عربی سے زیادہ موزوں اور بہتر الفاظ نہیں پائے جاتے اِن معنوں میں کہ اگر ان الفاظ کے مفہوم پر کافی غور و تدبّر کیا جائے تو سخن اور سخنور کی حقیقت اور ان کے متعلق تمام ضروری مباحث پوری صحت اور درستی کے ساتھ واضح ہو جائیں۔ ہاں شعر اور شاعر فی الواقع ایسے لفظ ہیں جو خود اپنی حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں: ضرورت فقط اس امر کی ہے کہ ہم سُن سکیں اور سمجھ سکیں۔ شعر کا مفہوم ہے احساس اور شاعر کا مفہوم حسّاس یعنی زبردست احساس کا مالک۔ احساس ہی شعر کی اساس ہے، یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے شعر کی تمام کائنات پھوٹ نکلتی ہے۔ احساس شعر کا بنیادی عنصر ہے، اس کے وجود سے دوسرے عناصر جنم لیتے ہیں اور اسی کی گود میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ زبردست احساس یا جذبہ کی مثال ایک پانی کے پہاڑ یا آگ کے سمندر کی ہے جو قلبِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے کر اس میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ انسان پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت سے دو باطنی قوتیں وجود میں آتی ہیں یا بیدار ہوتی ہیں: ایک کا تعلق بصارت سے ہے دوسری کا سماعت سے، ایک دیکھتی ہے دوسری سنتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کو ایک چشمِ بینا عطا ہوئی ہے جس کی گرمیٔ نگاہ کے سامنے زمین و آسمان کی پہنائیوں کے مادی پردے پگھل پگھل کر گرے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے تابستان کے آفتاب کی کرنوں سے برف کے تودے پانی ہو کر بہ جاتے ہیں۔ یہ چشم فضائے مادی کے پردوں کو چیرتی ہوئی ضمیرِ کائنات کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے اور ایک نئے جہان کے مشاہدے میں محو ہو جاتی ہے، نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود ایک نیا جہان پیدا کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دل کو ایک گوشِ شنوا عطا ہُوا ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو نغموں سے لبریز پاتا ہے، گویا نغموں کی ایک دنیا ہے جو خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔ عام طور پر چشم و گوش کا کام بالترتیب دیکھنا اور سُننا ہے لیکن احساس کی اس نئی دنیا میں آنکھیں دیکھنے کے علاوہ سنتی بھی ہیں اور کان سننے کے علاوہ دیکھتے بھی ہیں! یعنی دید و شنید کی قوتوں میں کچھ ایسی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے کہ باہمی امتیاز اُٹھ جاتا ہے یا کم از کم مشکل نظر آتا ہے۔ بہرحال ہم اس قوتِ دید کو تخیل اور قوتِ شنید کو موسیقی سے تعبیر کریں گے۔ پس شعر کے حقیقی عناصر یہی تین ہیں: احساس، تخیل اور موسیقی۔ اس اجمال کی

تفصیل کے لئے ہم چند مثالوں پر غور کرتے ہیں:۔

ایک عورت کا جوان بیٹا مر جاتا ہے۔ یہ عورت روز مرہ کی معمولی بات چیت سے ہی واقف ہے لیکن اس صدمے سے اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، اور خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنے جواں مرگ بیٹے کا ماتم کچھ ایسے انداز سے کرتی ہے جو الفاظ و معانی کی رُو سے بالکل غیر معمولی ہے اور جس کی عام حالات میں اس سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اس کے نوحے کچھ ایسی صورت اختیار کرتے ہیں: " ہائے یہ کیا اندھیر ہو گیا! روزِ روشن میں میری دولت لُٹ گئی! میں برباد ہو گئی! میرے بیٹے کو کیوں لے گئے؛ کہاں لے گئے؛ میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ اے خدا! آسمان کیوں گر نہیں پڑتا؛ زمین کیوں پھٹ نہیں جاتی؛ زلزلہ کیوں دنیا کو تہ و بالا نہیں کر دیتا؛ ہائے، سینے میں آگ سی دہک رہی ہے! میں جلی جا رہی ہوں ...... وغیرہ وغیرہ " ایسے مواقع پر حالات کے اختلاف کے باعث الفاظ و عبارات مختلف ہوتے ہیں، لیکن دو چیزیں بالکل واضح ہیں: ایک تو خیال کی پرواز سے معنی آفرینی کی غیر معمولی قوت ظہور پذیر ہوتی ہے، دوسرے الفاظ و عبارات کا اُتار چڑھاؤ نغمہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

فرض کرو کہ غنیم زبردست لشکر لے کر ملک کی سرحد پر آگیا ہے اور باشندگان ملک کی جان، مال، عزت، ناموس، آزادی، دین غرض سبھی کچھ خطرے میں ہے۔ ملکی فوجیں مقابلے کے لئے سرحد کی طرف کوچ کر رہی ہیں، اور ان فوجوں میں شامل ہونے کے لئے ایک نوجوان اسپ سوار شمشیر بکف اپنے گھر سے نکلا ہے۔ اس کا دل حبِ وطن و دین کے پاک جذبات سے لبریز ہے اور اپنے ملک کے خوبصورت پہاڑوں اور دریاؤں اور وادیوں اور سبزہ زاروں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے تو یہ جذبات کچھ اس طرح لہریں لیتے ہیں کہ وہ یکایک پکار اُٹھتا ہے: " اے سرسبز و شاداب سرزمین! تو ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور اس امانت کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی دلفریب چوٹیو! ہم غیور اور بہادر ہیں اور کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ تمہاری پاکیزگی کو دشمن کی نگاہ ناپاک آلودہ کر سکے۔ اے خوبصورت دریاؤ! پیشتر اس کے کہ دشمن کی کشتیاں تمہارے مقدس پانیوں میں تیریں انہیں ہمارے خون کے دریا میں تیرنا ہو گا۔ اے دلکشا وادیو! ہم اپنی آزادی و ناموس کی خاطر جانیں لڑا دیں گے اور خون کی ندیاں بہا کر تمہیں لالہ زار بنا دینگے۔ ہاں اے میری شمشیر آبدار! آ کہ میں ملک و قوم کی سپر بن کر میدانِ جنگ میں جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تو اپنی پرورش کا حق ادا کرے ...... وغیرہ وغیرہ " صاف ظاہر ہے کہ الفاظ کا زیر و بم اور خیالات کی بلندی زبردست جذبہ کے رہینِ منت ہیں۔

چاندنی رات ہے، ایک سبز و شاداب گل و لالہ سے پُر وادی ہے، اور پہاڑ کے دامن سے آبشار کے نغمے بلند ہو ہو کر تمام فضا کو ترنم سے لبریز کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان اس منظر کو دیکھتا ہے اور اس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ منظر کی پاکیزگی روحانی پاکیزگی کے جذبہ کو اُبھارتی ہے اور وہ کچھ اس انداز سے گویا ہوتا ہے:

" کیا دلفریب منظر ہے! کیا دلربا منظر ہے! کتنا پاکیزہ سماں ہے! چاند کا نُور میرے دل میں نشاط و سرور کی کیفیت پیدا کر رہا

ہے اور آبشار کے نغمے میری روح کی گہرائیوں میں اُترے چلے جارہے ہیں۔ اے خدا! جس طرح اس چاندنی نے اس فضا کو نورانی بنا رکھا
ہے اسی طرح مجھے اپنے نور کی چادر سے ڈھانپ دے، میرے سینے کو اپنی تجلیوں سے اس وادی کے مانند شگفتہ بنا دے، اور میرے دلِ
خوابیدہ میں روحانی زندگی کی لہر دوڑا دے تاکہ اس آبشار کی طرح ہمیشہ تیری حمد کے گیت گاتا رہوں"! اس مثال سے بھی واضح ہے کہ معانی
کی دلفریبی اور الفاظ کا ترنم ایک زبردست جذبہ کے ماتحت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ زبردست احساس کے ماتحت جب انسان گویا ہوتا ہے تو معانی والفاظ
کی ایک نئی دنیا خودبخود وجود میں آنے لگ جاتی ہے جس کے پیدا ہونے کا عام حالات میں کبھی امکان نہیں ہوتا یعنی دو باطنی قوتیں پیدا
ہوتی ہیں: ایک سے معانی کی آفرینش ہوتی ہے دوسری سے الفاظ کی پیدائش، ایک کو ہم تخیل کا نام دیتے ہیں اور دوسری کو موسیقی کا۔ اب
دیکھنا یہ ہے کہ تخیل اور موسیقی جنہیں ہم احساس کی پیداوار قرار دیتے ہیں اور "عناصرِ شعر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیا ہیں اور شعر میں
ان کے منصب کی کیا حقیقت ہے؛

تخیل

علم النفس کی کتابوں میں تخیل کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تخیل ایک ذہنی قوت ہے جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ
سے جمع شدہ معلومات میں تصرف کرکے نئے نئے تصورات یا تصورات کے مجموعے پیدا کرتی ہے۔ یہ ذہن کی ایک تخلیقی اور تعمیری قوت
ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے، اور جب کسی انسان میں اس قوت کا درجہ بہت بلند ہوجاتا ہے تو ہم اُسے شاعر کہتے ہیں۔
پس شاعر اور عام انسانوں کے درمیان یہی قوت مابہ الامتیاز کا کام دیتی ہے اور خود شعراء کا فرق مراتب بھی اسی کے مدارج بلندی وپستی سے پیدا
ہوتا ہے۔ شاعر میں اس قوت کی رفعت کا باعث اس کا زبردست اور فوق العادۃ شعور ہے۔ ہم پیشتر ذکر کرچکے ہیں کہ اس کا تعلق باطن
کی بصارت سے ہے۔ یہ عجیب وغریب قوت ایک ہی وقت میں ماضی، حال اور مستقبل کا مشاہدہ کرسکتی ہے، اور زمین وآسمان کی وسعتوں
کا ذرہ ذرہ اس کی خواہش کے مطابق آنِ واحد میں اس کے سامنے صف آرا ہوجاتا ہے۔ زمان ومکان کی پہنائیوں میں مرئی وغیرمرئی ذوی العقول
وغیر ذوی العقول، صوری ومعنوی، ظاہری وباطنی، غرض کوئی چیز، کوئی حالت، اور کوئی کیفیت نہیں جس کا یہ احاطہ نہ کرسکتی ہو۔ یہ قوت فی الحقیقت
ایک آتشین نگاہ ہے جو موجودات کے ظاہری اور سطحی پردوں کو چیر کر تہ تک پہنچنا اور ان کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہتی ہے۔ یہ سراپا جستجو ہے
اور اپنے عجیب وغریب تصرفات کی بنا پر نئے جہانوں کی تلاش اور تعمیر وتخلیق کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ یہی وہ نگاہ ہے جس کے باعث
شاعر ماضی کی تاریکیوں میں راہ پیدا کرکے اُن واقعات کی حقیقت کو دیکھتا ہے جس سے اُس کی ظاہری آنکھیں ناآشنا ہیں، اور اسی
کی بدولت وہ مستقبل کے چہرے کو بے نقاب کرکے طائرِ شعر میں نبوت کی سرحد پر پرواز کرنے کی طاقت پیدا کردینے پر قادر ہوسکتا ہے۔
تخیل کا سرچشمہ احساس ہے، چونکہ احساس کی گوناگونیوں کی کوئی انتہا نہیں اسلئے تخیل کے تصرفات کی تمام جزئیات پر حاوی

ہونا محال ہے۔ اصولاً شعر میں تخیل کے تصرفات کی تین صورتیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اوّلاً تخیل مختلف اشیاء کو مجتمع کرتا ہے، اور اس اجتماع سے نئی شکلیں وجود میں لاتا ہے۔ مثلاً شاعر قدرت کے کسی دلربا منظر پر نظر دوڑاتا ہے، اس کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے بعض کو منتخب کرلیتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے، اور بالآخر ان منتخب ٹکڑوں کو باہم جمع کرکے ان سے ایک نیا منظر پیدا کرتا ہے، اس طرح کہ وہ ٹکڑے ایک گل کے اجزاء غیر منفک معلوم ہوں لیکن جس طرح قدرت کا منظر ایک زندہ حقیقت ہے اسی طرح ضروری ہے کہ شاعر کی یہ مخلوق بھی زندگی سے لبریز نظر آئے، یہ نہ ہو کہ ایک مردہ ڈھانچ ہو جو جسم کی حیثیت تو رکھتا ہو لیکن رُوح مفقود ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی رُوح اس وقت تک نہیں پھونکی جاسکتی جب تک شاعر کا کارنامہ شدید احساس اور زبردست جذبے پر مبنی نہ ہو، گویا منظر قدرت کی دلربائی کا احساس تخیل میں وہ طاقت پیدا کرسکتا ہے جو شعر کو رُوح حیات سے لبریز کردے۔

ثانیاً شاعر ایک غم آمیز یا نشاط انگیز وجدانی کیفیت کے ماتحت ایک منظر قدرت کو دیکھتا ہے، اور پھر اس کیفیت کو منظر کے اندر منتقل کردیتا ہے یا منظر کو اس کا ماخذ قرار دیتا ہے۔ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ کسی خاص جذبے کے زیر اثر خارجی اشیاء میں بھی اسی جذبے کو منعکس دیکھتی ہے نیز خارجی اشیاء سے متاثر ہوکر خود اس میں کوئی خاص جذبہ پیدا ہوسکتا ہے: یعنی ہماری داخلی کیفیت خارجی ماحول کو اپنے رنگ میں رنگا ہوا دیکھتی ہے یا خارجی ماحول کا اثر اس کو خاص رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ علم النفس کے اس قاعدے کی رُو سے شاعرانہ تخیل وہ خاص وجدانی کیفیت منظر قدرت کو منتقل کردیتا ہے یا اس سے اخذ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے زندگی کی حقیقت سے اخذ کرتا ہے اور اپنی زندگی سے اس کی وحدت اور یگانگت کو ثابت کرتا ہے، اور پھر اپنے شاعرانہ کارنامے کو جاندار بنانے کیلئے اپنی رُوح کو اس کے مرکز میں رکھ دیتا ہے۔

ثالثاً تخیل ظاہری پردوں کو پھاڑ کر اشیاء کے اندر داخل ہوتا ہے اور ان کا تجزیہ کرکے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمیشہ داخلی نقطہ کو لیتا ہے سطحی پردوں کو دُور پھینک دیتا ہے، اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اشیاء کے ضمیر تک اپنی راہ پیدا نہ کرلے۔ اس صورت میں تخیل اپنی بصیرت کی حدّت اور تیزی کے باعث سطحیت سے تجاوز کرکے اشیاء کی اندرونی صداقت تک پہنچ جاتا ہے بلکہ اس بصیرت کی حدت اور تیزی کا سرچشمہ وہ زبردست جذبہ ہے جو انسان میں گہرائیوں تک اُترنے اور حقیقت تک پہنچنے کی قوت پیدا کرتا ہے۔

تصرفات تخیل کے سلسلے میں ایک اور امر کا ذکر بھی ضروری ہے۔ علم النفس کی کتابوں میں حافظۂ انسانی کی تین صُورتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق قوت باصرہ، قوت سامعہ اور قوت لامسہ سے ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور صُورت بھی ہے جس کی رُو سے ہم ان احساسات و جذبات کو بھی محفوظ رکھ سکتے ہیں جو کسی واقعہ، حادثہ، یا منظر کی وجہ سے ہمارے قلب میں پیدا ہوئے ہوں۔ اس صُورت میں حافظہ کی وہ شکل جو قوتِ باصرہ سے تعلق رکھتی ہے اس خاص واقعہ، یا حادثہ، یا منظر کو رُونما کرتی ہے اور ہمارے اندر وہی احساسات لہریں لینے لگ جاتے ہیں جو اس خاص لمحہ میں پیدا ہوئے تھے لیکن بعض اوقات ان احساسات کے علاوہ نئے جذبات بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ تخیل کا کرشمہ ہے جو

تازہ احساسات وجذبات کو پیدا کرلیتا ہے اور پھر خود اس سرچشمہ سے تازہ زندگی حاصل کرتا ہے تخیّل کا یہی تصرف ہے جس کے باعث نہ فقط قلب شاعر میں گذشتہ مشاہدات وتجارب کے سلسلے میں اس کے ذاتی احساسات و جذبات عود کر آتے ہیں، بلکہ جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے احساسات وجذبات کا اندازہ بھی کرسکتا ہے اوران میں خاص احساسات و جذبات پیدا بھی کرسکتا ہے بظاہر اس تقریر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کلیتہً تخیّل بھی احساس کو پیدا کرسکتا ہے لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شاعرانہ تخیّل میں جذبات و احساسات پیدا کرنے کی قوت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ احساس کی آغوش میں پل کر جوان ہوتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو شاعر اور غیر شاعر میں ما بہ الامتیاز کا کام دیتی ہے۔ شاعرانہ احساس ہی وہ آگ ہے جو شاعرانہ تخیّل کی گرمی وقوت کا منبع ومخزن ہے۔ ہاں البتہ اس علمی نکتہ سے ہم یہ نتیجہ ضرور اخذ کرسکتے ہیں کہ شعر میں احساس و تخیّل لازم وملزوم ہیں اوران میں تفریق وتقسیم نہیں کی جاسکتی۔

ان بیانات سے یہ امر واضح ہوگیا کہ شاعرانہ تخیّل کے تصرفات زبردست احساس کے رہین منت ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی مخلوق زندگی کی دولت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتی جب تک اس کا خالق اس میں اپنی روح نہ پھونک دے۔ یہ کائنات زندگی سے مالامال ہے کیونکہ اس میں خالق کائنات نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ شاعر اپنے کارنامہ میں اپنی روح پھونک کر ہی زندگی پیدا کرسکتا ہے اوراسی روح کو ہم شدید احساس اور زبردست جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ احساس ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے شعر کے دوسرے عناصر پھوٹ نکلتے ہیں، اور اس کے بغیر شعر ایک زندہ مخلوق نہیں بلکہ ایک بے جان لاش کی حیثیت رکھتا ہے۔

تخیّل کی بحث میں یہ نہایت ضروری نکتہ ہے کہ اس کی حیثیت تخلیقی اور تعمیری ہے، اور اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ خیال اور تخیّل میں التباس کا اندیشہ ہے۔ یہ دو بکلی مختلف ذہنی قوتیں ہیں: تخیّل شعر کی عظمت کا سرچشمہ ہے، خیال فقط آرائش وزیبائش کا کام دیتا ہے۔ تخیّل کی طرح خیال کے بھی تصرفات ہیں۔ اولاً خیال بھی مختلف اشیا میں تصرف کرکے نئی شکلیں بناتا ہے لیکن ان شکلوں سے ایک کل وجود میں نہیں آتا، بلکہ مختلف اجزا بغیر کسی اتحاد اور یگانگت کے ایک بے جان اور بے ترتیب ڈھانچ کا نقشہ پیدا کرتے ہیں۔ ثانیاً شاعر اپنے کارنامۂ خیالی میں اپنی روح کو دخل نہیں کرتا۔ ثالثاً خیال فقط ظاہر کو دیکھتا ہے اور گو اشیا کا خارجی نقشہ نہایت صاف طور پر پیش کرسکتا ہے لیکن اس میں احساس مفقود اور وہ جذبے سے کلیتہً عاری ہوتا ہے۔ خیال کی حقیقت سمجھ لینے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ احساس تخیّل کا ضروری جزو ہے، نہیں بلکہ یہی احساس ہے جس کے باعث تخیّل کی ممتاز تخلیقی وتعمیری حیثیت وجود میں آتی ہے۔

موسیقی

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ احساس سے دو باطنی قوتیں بیدار ہوتی ہیں، ایک معنی آفرین ہے دوسری خالق الفاظ، پہلی کو ہم تخیّل کہتے ہیں دوسری کو موسیقی۔ تخیّل شعر کے باطن سے تعلق رکھتا ہے اور موسیقی ظاہر سے۔ تخیّل چشم احساس ہے اور موسیقی گوش احساس۔ جب زبردست احساس سے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو دل ایک ساز کی طرح نغموں سے لبریز ہوجاتا ہے اوراس سے دلاویز نوائیں بلند ہونا شروع ہوجاتی ہیں

ان نواؤں کی نوعیت خود احساس کی نوعیت پر مبنی ہے: اگر احساس نرم اور لطیف ہے تو نوائیں بھی نرم اور لطیف ہونگی، اور اگر احساس خشن اور درشت ہے تو نواؤں میں بھی خشونت اور درشتی ہوگی۔ اس نرمی و لطافت اور خشونت و درشتی کے نقوش جب ہماری لوحِ حافظہ پر مرتسم ہوتے ہیں اور ہم ان کی ترجمانی کے لئے اپنی زبان میں خاص آوازیں اور آہنگ وضع کرتے ہیں جو اسی توازن و تناسب، اسی ترتیب و تنظیم اور اسی دلاویزی و دلربائی کو اپنی حقیقی صورت میں قائم رکھ سکیں، تو ہمارے نزدیک شعر میں موسیقی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو "وزنِ شعر" اور "انتخابِ الفاظ" کے مباحث کو پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں شعر میں وزن ہونا چاہئے جو اسے نثر سے ممتاز کر سکے، اور شعر میں مناسب الفاظ کا استعمال ہونا چاہئے جو خیال کی مخصوص نوعیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ بالکل صحیح اور درست مباحث ہیں جن کا قدرتی طور پر ہر زبان کی تاریخِ شعر میں پیدا ہونا ضروریات سے ہے، اور عام لوگ جب تک ان مباحث سے خوب واقف نہ ہو جائیں شعر کے محاسن سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ شعر کی وسیع اور ہمہ گیر حقیقت کے پیشِ نظر یہی مباحث بعض پیچیدگیوں کا بھی باعث ہو سکتے ہیں: مثلاً وزنِ شعر سے ہماری مراد یہی ہے نا کہ جو اوزان اور بحور علمِ عروض کے مصنفوں نے کتابوں میں درج کر دیئے ہیں ان کے علاوہ کوئی اور وزن اختیار نہیں کیا جا سکتا اور جو عبارت ان اوزان کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی وہ شعر نہیں کہلا سکتی؛ نیز کسی خاص خیال کے اظہار کے لئے "انتخابِ الفاظ" کے مسئلہ میں انہی اسالیب و معاییر کو مدِّ نظر رکھنا ہوگا جنکی پہلوں نے تعیین کر دی ہے؛ علاوہ بریں ممکن ہے الفاظ و عبارات کا ایک مجموعہ وزنِ عروضی کے مطابق ہو لیکن اس میں احساس کا فقدان ہو، لہذا اس پر شعر کا اطلاق نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے "عناصرِ شعر" کی حقیقت کے سلسلے میں ان عنوانوں کی بجائے موسیقی کا جامع لفظ اختیار کیا ہے، جو وزن اور الفاظ کے تمام مباحث پر بھی حاوی ہے اور شعر کی حقیقت سے بھی ہمیں دُور نہیں ہونے دیتا، شاعر جو کہ شعر کے سرچشمے سے براہِ راست سیراب ہوتا ہے ان مباحث سے سروکار نہیں رکھتا، بلکہ اس کے لئے شعر کے ظاہر اور باطن کا مسئلہ ایک ہی ہے۔ ہمارے نظریہ کو سمجھنے کے لئے یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ موسیقی کی تکمیل ناممکن ہے جب تک وہ تخیل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شعر میں احساس و تخیل لازم و ملزوم ہیں، لہذا احساس و تخیل شعر کا باطن ہیں اور موسیقی ظاہر، پس جب تک موسیقی کاملاً احساس و تخیل کی آئینہ داری کا حق ادا نہ کرے، شعر کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے احساس، تخیل اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں اور شعر کے اجزاءِ غیر منفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشہور انگریز مصنف کارلائل نے جو شعر کو "خیال لبریز از موسیقی" سے تعبیر کیا ہے اس کے یہی معنی ہیں۔

بہرحال شعر احساس کی پیداوار ہے اور خود احساس ہی موسیقی کے مسئلے کو بہترین طریق سے حل کر سکتا ہے۔ احساس کا تنوع زندگی اور اس کے مشاغل کے تنوع پر منحصر ہے، اس لئے اوزان و الفاظ کی گوناگونی کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ پس جب ہم عنصرِ شعر کی حیثیت سے موسیقی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہے کہ شعر کے الفاظ میں نہ فقط بحیثیت مجموعی وہ ترنم پایا جائے جو عین احساس کے ترنم کی صدائے بازگشت ہو بلکہ ان کا انتخاب ہر طرح سے ایسا جامع و حاوی ہو کہ چشمِ احساس یعنی تخیل نے جس چیز کا مشاہدہ کیا تھا اس کی تصویر پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جائے۔

(باقی)

محمد اکبر منیر

قہقہہ مار قہقہہ!

زندگی کیا، فنا ہے کیا؛ کس کو خبر خدا ہے کیا ؟
قہقہہ مار قہقہہ !

دل سے یہ پوچھتا ہے کیا؛ دُکھ کی ترے دوا ہے کیا ؟
قہقہہ مار قہقہہ !

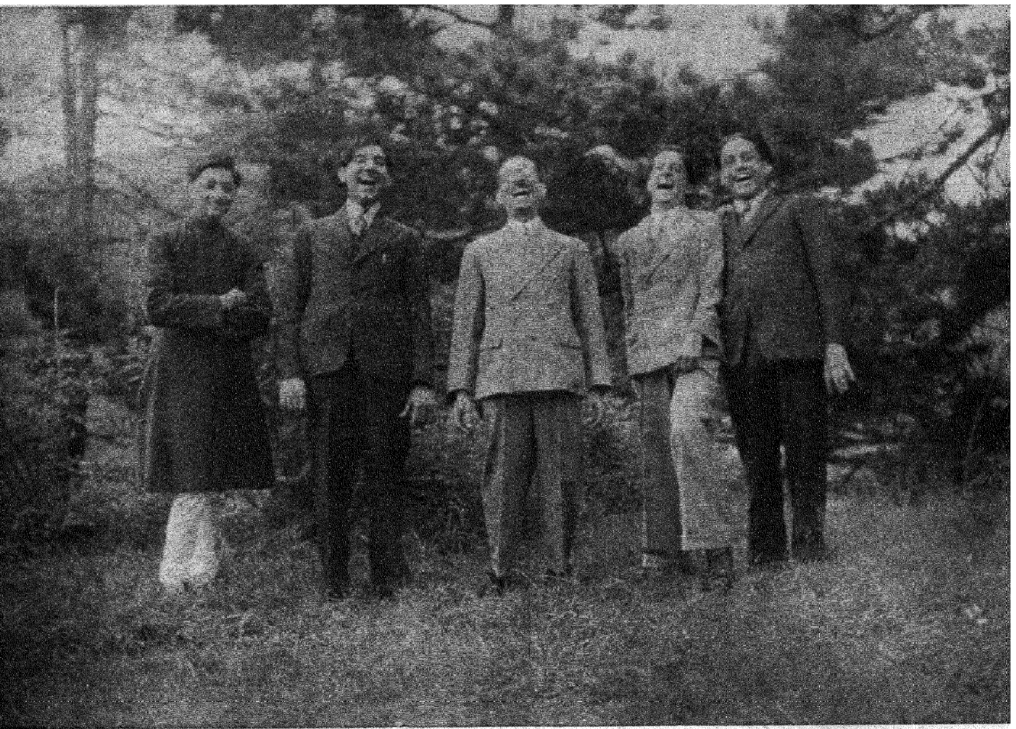
غم ہے بہت بُری بلا ہنس نہ کبھی نہ مُسکرا !
قہقہہ مار قہقہہ !

عشق خرد وفا بقا! رکھتا ہے ان پہ آسرا ؟
قہقہہ مار قہقہہ !

جو کہے کوئی دوسرا کہنے دے تجھ کو اس سے کیا ؟
جو کرے کوئی دوسرا کرنے دے تجھ کو اس سے کیا ؟
قہقہہ مار قہقہہ
قہقہہ مار قہقہہ !

قہقہے کا ہے یہ مزا جس نے سُنا وہ ہنس پڑا
ہنس پڑا لوٹ ہوگیا ہی ہی ہی ہہ ہا ہہ ہا !
قہقہہ مار قہقہہ !
قہقہہ مار قہقہہ !!

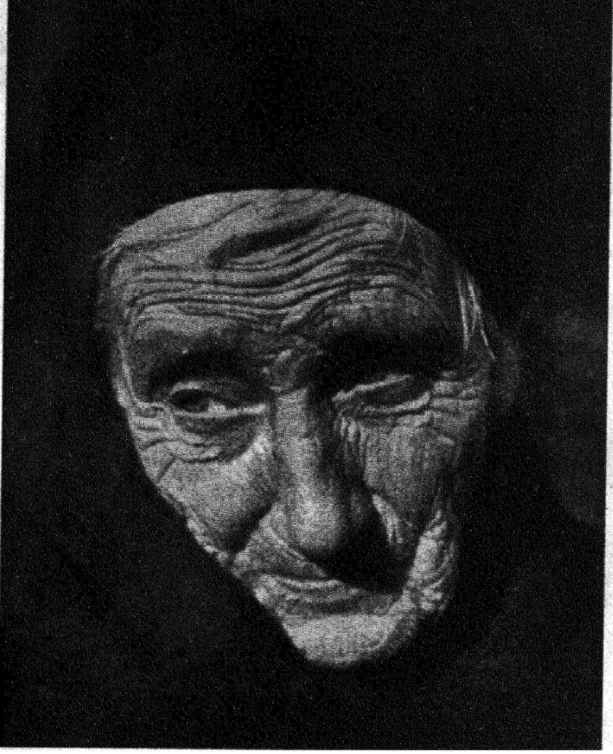
ب



قہقہہ



بچپن



بڑھاپا

بھکشا پریم کی

بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

داسی کی سُدھ لیجو پریتم
کھڑی ہوں کرپا کیجو پریتم
واری جاؤں دیجو پریتم
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

میرے سوامی میرے پیارے
ناتھ مرے جیون کے سہارے
مانگنے آئی تیرے دوارے
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

دُور سے چل کر آئی بھکارن
کر دو مکت مرا یہ جیون
دیدو دیدو لے کر جوبن
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

اندر جیت شرما

باغی

چیری کوف کو موجودہ روسی ادب میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس کا ایک ڈراما "The Jew" بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ چیری کوف اوائل عمر میں طبابت کا پیشہ کرتا تھا لیکن ادبیات سے شغف پیدا ہو جانے کے بعد اس نے طبابت ترک کر دی۔ طبابت کے پیشے کی وجہ سے اسے فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں پر نظر کرنے کا کافی موقع ملا اور اس نے ان تجربات کو اپنی تصنیفات میں واضح طور سے بیان کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات میں ایک خاص اثر پایا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل فسانہ چیری کوف کے ایک مشہور افسانے "Strained Relations" کا ترجمہ ہے جس میں اس نے ایک خردسال لڑکے کے جذبات کو نہایت مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔

(۱)

مشا خاموش تھا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ کھانا کھانے کے لئے اسے لاکھ لاکھ بلایا گیا مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ سہ پہر کو مشا کی بہن بلانے آئی لیکن مشا کو نہ جانا تھا نہ گیا۔ جب بہن نے زیادہ اصرار کیا تو مشا منہ پھلا کر کہنے لگا "تمہارا جو دل چاہے کرو لیکن مجھے نہ ستاؤ میں ہزار دفعہ کہہ چکا کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا" مشا کی بہن قہقہہ مار کر بولی "تمہارے نہ کھانے کی پروا کسے ہے ایک دن کیا دس دن کھانا نہ کھاؤ جب بھی کسی کو خبر نہ ہوگی" بہن تو زخم پر نمک چھڑک کر ہنستی ہوئی چلی گئی اور مشا سنجیدگی سے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔" کیا واقعی اماں ابا مجھے منانے نہیں آئیں گے؟ نہیں یہ ناممکن ہے! نتا جھوٹی ہے اماں میرے کھانا نہ کھانے سے ضرور پریشان ہوں گی۔ پھر بس کیا کروں؟ پریشان ہیں تو ہوں۔ قصور سراسر اماں اور ابا کا ہے۔ انہوں نے اتنی سی بات پر کہ لاطینی میں میرا ایک نمبر آیا سب لوگوں کے سامنے خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا اور یہاں آخر میں یہ بھی تو کہا تھا کہ مشا موچی بننے کے لائق ہے۔ خیر موچی بننا منظور مگر ان کے یہاں کا کھانا تو نہیں کھاؤں گا" مشا ایک کتاب دیکھ رہا تھا نظر کتاب پر تھی دل کھانے کے خیال میں تھا اور کان ماں باپ کی آواز کے منتظر تھے کہ اتنے میں پاس والے کمرے سے ماں کی آواز سنائی دی "نتا کیا مشا اب تک کمرے سے باہر نہیں نکلا؟" نتا نے ہنس کر کہا "جی ہاں اب تک روٹھے ہوئے ہیں۔" "بہرحال" باپ نے سنجیدہ لہجے میں کہا" باغی کے لئے کوئی کھانے کی چیز بھجوا دینا چاہئے" کمرے کے باہر سے مشا کے باپ نے اس کو پکارا لیکن اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دوبارہ مشا کے باپ نے ڈانٹ کر کہا "مشا باہر کیوں نہیں آتے ہو"۔ "کیوں کیا کام ہے؟" مشا چلا کر بولا۔

"کام! کام کیا؛ بس یہی کام ہے کہ باہر آجاؤ۔"

"میں کیوں آؤں باہر؛ ایک موچی کا بھلے مانسوں میں کیا کام؟"

باہر سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں اور ان آوازوں کو سُن کر مشا کے دل میں اُمید کی جھلک بھی پیدا ہوئی کیونکہ بالعموم قہقہے شکر رنجی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور اماں ابا جی کھول کر ہنسنے کے بعد مشا کو منانے آجاتے تھے مگر بُرا ہو اس فتنی ننا کا جس نے عین کریال میں غلہ لگا یا۔ کہنے لگی "چلئے بھی ابا مشا ابھی منیں گے تھوڑی" ماں باپ کو پلٹتے دیکھ کر مشا کے غصے کی کوئی حد نہیں رہی۔ چپکے چپکے بد بدانے لگا "مرے اللہ کرے ننا اور اس کا منگیتر ـــــ وہ بھی ڈوب جائے خدا کرے۔ آخر اس فتنی سے پوچھا کس نے تھا کہ مشا کب تک من جائے گا؟ یہ بولی کیوں؛" جب بد بدانے سے بھی دل کی بھڑاس نہیں نکلی تو ننا کے رسالے کی تصویریں پھاڑنا شروع کر دیں اور جب اس طرح بھی اضطراب دل میں کمی نہیں ہوئی تو جیب سے پنسل نکال کر رسالے کی ایک تصویر جس میں ایک نوجوان مرد ایک لڑکی کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا کے نیچے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا "یہ تصویر ننا اور اس کے منگیتر کی ہے اور یہ دونوں بڑے اُلّو ہیں۔"

(۲)

سُورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ ماما نے کنڈی کھڑکھڑائی۔

"مشا میاں!"

"جاؤ جاؤ"

"اچھا تم کمرے کے باہر نکلو تو"

"جاؤ بھئی جاؤ ہم کہہ چکے کہ ہم اس گھر میں کھانا نہیں کھائیں گے جہاں ہمیں موچی کہا جائے۔"

ماما چپ چاپ واپس چلی گئی۔ میاں مشا دل ہی دل میں سوچنے لگے "ماما کو اماں ہی نے بھیجا ہوگا۔ پھر کیا چلا جاؤں؟ بھوک بھی زور کی لگی ہے۔ مگر نہیں اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔ دب کر گئے تو آب کی دفعہ بھنگی بننے کے لائق سمجھے جاؤ گے۔ ماما کے بُلانے پر ہرگز نہیں جانا چاہئے۔ ہاں اگر ابا یا اماں منانے آئیں اور آئندہ موچی نہ کہنے کا وعدہ کریں تو اور بات ہے۔ خیر ابا تو آنے سے رہے مگر اماں گھنٹے دو گھنٹے میں ضرور آئیں گی" لیکن دو کیا تین گھنٹے گزر گئے اور اماں منانے نہیں آئیں۔ شدت یاس نے دماغ کو معطل کر دیا تھا مگر پیٹ کی آگ نے ایک بات سمجھا ہی دی۔ ابھی دو مہینے ہوئے مشا کے ایک ہم جماعت لڑکے ایوناف نے ایک کتاب بیچ کر بڑا عمدہ چاقو خریدا تھا پھر مشا اس ترکیب پر کیوں نہ عمل کرے؛ اس وقت کوئی کتاب فروخت کر دی جائے پھر جب ماں باپ سے میل ہو جائے تو وہی کتاب خرید لی جائے۔ مشا کو جغرافیہ سے نفرت تھی اس لئے نظرِ انتخاب سمرناف کی کتاب "ایشیا۔ افریقہ۔ امریکا" پر پڑی۔ کتاب جیب میں رکھی اور عقبی راستے سے بازار کی راہ لی۔ بازار میں خوانچے والے صدا لگا رہے تھے "سموسے گرما گرم" "ٹھنڈی لسی" ۔ مشا

کے توسنِ ہمت پر ان صداؤں نے تازیانے کا اثر کیا اور وہ دوڑتا ہوا کتابوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔

"کیوں؟ کیا ہے؟" دکاندار نے سوال کیا۔

"کیا آپ کتابیں خریدتے ہیں؟" مشا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کون سی کتاب بیچنا چاہتے ہو؟"

"ایشیا - افریقہ - امریکا - بالکل نئی ہے۔"

"سمرناف کی لکھی ہوئی۔"

"جی ہاں۔"

"اوہو! یہ تو پرانا ایڈیشن ہے - خیر میں دس کوپک میں خرید لوں گا۔"

"مجھ سے تو ایک صاحب نے کہا تھا کہ بیس کوپک سے کم میں نہ بیچنا۔"

دکاندار نے جمائی لے کر کتاب واپس کر دی۔

"خیر تو پندرہ کوپک میں مول لے لیجئے۔"

دکاندار نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"لائیے پھر دس کوپک ہی دے دیجئے۔"

دکان دار نے دس کوپک مشا کے حوالے کئے اور کتاب کو بے پروائی سے ایک کونے میں ڈال دیا۔" میاں صاحبزادے" دکاندار نے جمائی لے کر کہا "سودا تو اچھا ہو گیا - کوئی اور دکاندار تمہیں پرانے ایڈیشن کے دس کوپک کبھی نہ دیتا اور ——— چلے کہاں؟ ایک بات سنتے جاؤ - اب اگر تم کو یا تمہارے کسی دوست کو کوئی کتاب بیچنا ہو تو پہلے میری دکان پر آنا" مشا نے ہاں ہوں کر کے اپنا پیچھا چھڑایا اور خوانچے والوں کے پاس آ گیا۔

(۳)

جب تک جیب میں پیسہ نہیں تھا مشا کی نظریں خوانچوں پر مایوسانہ انداز سے پڑتی تھیں مگر اب دس کوپک پاس ہونے کی وجہ سے مشا کی نگاہ سے اعتمادِ نفس کا اظہار ہوتا تھا - دل تو چاہتا تھا کہ بیک وقت سب چیزیں خرید لی جائیں لیکن اس دنیا میں سب ارمان کیونکر نکل سکتے ہیں؟ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے پہلے تو تین کوپک کا بہت سا حلوا مول لیا جب حلوا کھا چکے تو مزے دار چیزیں یاد آئیں - پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ذرا شان سے پوچھا" اے میاں دکان والے یہ سموسے کتنے کتنے ہیں"۔ دکاندار نے مسکرا کر جواب دیا "سرکار بہت سستے ہیں - پانچ کوپک کے دو" سرکار کا لفظ سن کر مشا بہت خوش ہوا اور بلا تامل پانچ کوپک دوکاندار کے

حوالے کر دیئے۔ پیٹ بھر گیا تو پیاس معلوم ہوئی۔ لے دے کے دو کوپک رہ گئے تھے۔ دل نے کہا کہ میاں مشا یہ دو کوپک بھی خرچ کر ڈالے تو کل کیا کھاؤ گے ؟ مگر مشا کو اطمینان تھا کہ کل تک ماں باپ سے میل ملاپ ہو جائے گا اس لئے دونوں کوپک دے کر دو بڑے بڑے گلاس میٹھے کے پیئے۔ میٹھا پیا تو سر کچھ چکرانے سا لگا اور میاں مشا چپ چاپ گھر روانہ ہو گئے۔ سمجھتے تھے کہ تھوڑی دیر تک لیٹنے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی مگر چکر بڑھتا ہی گیا بلکہ چکر کے ساتھ ساتھ متلی بھی شروع ہو گئی۔ مشا نے جوں توں کر کے کمرے کی کنڈی کھولی اور پھر لیٹ کر بڑے زور سے کراہنا شروع کیا۔ دشمنوں پر باغی کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا مگر کراہنے کی آواز سن کر مخالف کیمپ میں ہلچل مچ گئی۔ ننا اور اماں نے دروازے کو بند سمجھ کر اس پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ گرتے گرتے بچیں۔ مشا کو قے کرتے دیکھ کر اماں کے آنسو نکل آئے اور انہوں نے رو رو کر پوچھا "بچے سچ سچ بتا دے تو نے کوئی زہر تو نہیں کھا لیا ؟"

مشا ابکائیوں کو روک کر بولا " اماں ـــــ عوعو ـــــ میں نے ایشیا ـــــ عوعو ـــــ افریقہ امریکا بیچ کر ـــــ عوعو ـــــ میٹھا پیا تھا ـــــ اور سموسے کھائے تھے ـــــ عوعو "

"ہائے نہ جانے میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے ؟" ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا " ننا سنا تم نے مشا کیا کہتا ہے کہ اس نے افریقہ امریکا کو فروخت کر دیا۔ ارے کوئی ڈاکٹر کو اور مشا کے باپ کو تو بلا دے "۔ باپ ڈاکٹر کے ساتھ گھبرایا ہوا آیا اور پوچھنے لگا " بتاؤ تو بات کیا ہے ؟ " ماں نے سسکیاں بھر کر جواب دیا " لڑکے کا دماغ پھر گیا ہے کہتا ہے میں نے ایشیا۔ افریقہ اور امریکا کو بیچ کر سموسے کھائے "۔ ڈاکٹر مسکرا کر بولا " مادام پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں لڑکا سچ کہتا ہے قے میں غذا نکلی ہے یہ سب فتور اسی ثقیل غذا کا ہے "۔

ڈاکٹر کی دوا سے تھوڑی دیر کے بعد مشا کو نیند آ گئی۔ باغی آرام سے سو رہا تھا اور تینوں دشمن خاموشی کے ساتھ باغی کی نگرانی کر رہے تھے !

(چیری کوف) طالب صفوی

اے یاد اے فراموشی !

اچھی اچھی پیاری پیاری باتوں کو اے یاد ! تو یاد کیا کر اور جب وہ سب بھول جائیں اور مصیبتیں ٹوٹ پڑیں تو اے فراموشی ! تو بھلا دیا کر۔

گلچیں

چراغِ تہِ داماں

(۱)

خامشی پرور فضا کی تیرگی ہنگامِ شام!
ساحلِ دریا پہ اک دوشیزہ تھی محوِ خرام

سبزۂ پامال تھا اُس کے قدم سے کہکشاں
اور تہِ دامن نہاں تھا اک چراغِ ضوفشاں

از رہِ اُلفت کہا میں نے کہ "اے جانِ شباب!
اے کہ تیرا حُسن ہے شمعِ شبستانِ شباب!

"روشنی سے ہے مرا تاریک گھر نا آشنا
میرے ویرانے سے ہیں شمس و قمر نا آشنا

"رات ہو یا دن مرے ہاں ایک حالت ہے مدام
مٹ چکا ہی میرے دل سے امتیازِ صبح و شام

"اس چراغِ زیرِ داماں کی تمنّا ہے مجھے
بے سر و ساماں ہوں ساماں کی تمنّا ہی مجھے"

میری عرضِ شوق پر وہ مُسکرا کر رہ گئی
مسکرائی اور جاتے جاتے اتنا کہہ گئی

"میں اسے فرطِ محبت سے جلا کر لائی ہوں
سطحِ دریا پر عقیدت سے بہانے آئی ہوں"

دُور جا کر پھر سپردِ آب کر ڈالا اُسے
میں کنارے پر تھا تنہا دیکھنے والا اُسے

اب وہ پہلی سی نہیں باقی تھی اُس میں آب و تاب
بہ رہا تھا سینۂ دریا پہ مانندِ حباب!

(۲)

شام کی ظلمت پہ تھی دوشیزگی چھائی ہوئی
محفلِ فطرت میں تھی ہر چیز سنولائی ہوئی

جل رہے تھے دھیمے دھیمے ایک بستی میں چراغ
لالہ خود رو سے روشن تھی فضائے دشت و راغ

پھر نظر آئی وہی دوشیزۂ رنگیں ادا
اپنے دامن میں چھپائے ایک ننھا سا دیا

التجائے شوق پر کہنے لگی وہ ناز سے
"پیش کرنا ہے اسے تاروں کی محفل میں مجھے"

(۳)

جل رہے تھے ساحلِ دریا پہ مٹی کے دیئے
آ رہے تھے لوگ دیوالی منانے کے لئے

یوں نظر افروز تھی روشن چراغوں کی بہار
جس طرح جگنو چمکتے ہوں قطار اندر قطار

چار سُو میری نگاہِ شوق پھر آوارہ تھی
صُورتِ زیبا کسی کی جنّتِ نظارہ تھی

شمعِ جاں افروز تھا خود جس کا حُسنِ دلنواز
جس کے جلوے تھے فروغِ حرمِ سے بے نیاز

جا رہی تھی لیکے دامن میں چراغِ نیم جاں
اُن چراغوں کی طرف وہ صُورتِ ابرِ رواں

میرے جذباتِ عقیدت کی اُسے پروا نہ تھی
یا وہ میری تیرہ بختی سے ابھی بیگانہ تھی

اُن چراغوں میں دیا اُس نے وہ شامل کر دیا
یاس سے تاریک میرا خانۂ دِل کر دیا

رہ گیا جل بجھکے ساتھ اوروں کے روشن چراغ
آ گیا لے کر دلِ مایوس پر میں ایک داغ

روشن اب اِس داغ سے ہے خانۂ ویراں مرا
اب یہی لے دے کے اس دنیا میں ہے ساماں مرا

(ملخص و ماخوذ از گیتان جلی) ~~~~~~~~ حفیظ ہوشیارپوری

آزادی

مشرق کے زندۂ جاوید شاعر "خلیل" کا جب آج سے پانچ برس پہلے انتقال ہوا تو کون کہہ سکتا تھا کہ دنیا اس کی اتنی قدر کرے گی لیکن اب اس کی نظموں کا ترجمہ تقریباً بیس مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور دنیا کے ہر حصہ میں اس کے مداح پیدا ہو گئے ہیں۔ افسوس ہوگا اگر اردو داں طبقہ اور خصوصاً قارئینِ "ہمایوں" کو خلیل کی ولولہ خیز شاعری اور اس کے ہنگامہ خیز فلسفہ سے روشناس کیا جائے۔ ذیل میں اس کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جس سے اس کے اعلیٰ تخیل اور عمیق مشاہدہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ — ع ح

میں نے تمہیں گھروں میں اور شہر کے دروازے پر "آزادی"
کو سجدہ کرتے دیکھا ہے
اسی طرح جس طرح ایک غلام اپنے آپ کو ظالم آقا کے
قدموں پر گرا دیتا ہے
اور اس کی جھوٹی تعریف کرتا ہے چاہے وہ اسے قتل
ہی کیوں نہ کر دے
میں نے معبد اور فصیلِ شہر کے سایہ میں کتنے ہی آزادی
کا دم بھرنے والوں کو دیکھا ہے
ان کی گردن میں طوق تھا اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے
یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کیا یہ لوگ آزاد ہیں ؟
نہیں !
تم اسی وقت آزاد ہو سکتے ہو جب آزادی کی خواہش
بھی تمہیں غلام نہ بنا سکے
اور جب کسی خاص قسم کی آزادی تمہارا مطمحِ نظر نہ ہو +
آزاد وہ نہیں جو غم، فکر اور احتیاج سے فارغ ہو

آزاد وہ ہے جو ان کے ہوتے ہوئے بھی آزاد رہے
تم قیودِ لیل و نہار سے نکلنا چاہتے ہو تو ان زنجیروں
کو توڑ دو۔
جو تم نے صبحِ شعور کو قبول کی تھیں
ان میں سے مضبوط ترین زنجیر وہ ہے جسے تم "آزادی"
کہتے ہو
اسے زیور نہ سمجھو
یہ انسان کی گردن کا گراں ترین بار ہے
اسے اُتار کر پھینک دو اگرچہ اس کی چمک تمہاری
نظر کو خیرہ کرتی ہے
تم نے خود اس کی غلامی قبول کی تھی
اپنی خطاؤں سے توبہ کرو
اپنے دل کے ان ٹکڑوں کو پھینک دو جن پر غلامی
کا نام رقم ہے
اپنے عملوں کا کفارہ دو
اگر تم آئینِ غلامی کو مٹا دینا چاہتے ہو تو یہ سن لو

یہ قانون تمہارے ہاتھ سے تمہاری پیشانی پر لکھا
گیا تھا
تم قانون کی کتابیں جلا کر اسے نہیں مٹا سکتے
تم سمندر کے پانی سے بھی اسے نہیں دھو سکتے
جب تک تم اپنے دل سے اس کا نشان نہ مٹا سکو
اور اگر تم ایک ظالم بادشاہ کو تخت سے اُتارنا
چاہتے ہو
تو پہلے اپنے دل کو طلسمِ شہریاری سے آزاد کرا لو
ایک ظالم بادشاہ آزاد اور غیور لوگوں پر حکومت
نہیں کر سکتا
مگر ان کی "آزادی" انہیں غلام بناتی ہے اور ان
کی "عزت" انہیں رسوا کرتی ہے
اسی طرح غم تمہارے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتا جب
تم خود یہ بات نہ چاہو۔
تم غم سے آزاد ہونا چاہتے ہو مگر اسی "غم" کی تم
نے آرزو کی تھی
تم دشمن سے ڈرتے ہو مگر تیغ دشمن کے ہاتھ میں
نہیں تمہارے دل میں ہے۔ اپنے دل پر نظر ڈالو
تمہارا دل کائنات کی نیرنگیوں کی تماشا گاہ ہے
جہاں غم اور خوشی ہم آغوش ہیں
جہاں مرغوب و نامرغوب پہلو بہ پہلو رہتے ہیں
جہاں آزادی اور غلامی بہنوں کی طرح رہتی ہیں
وہاں ہر چیز ہے
وہ جس کی تم آرزو کرتے ہو
اور وہ جس سے تم ڈرتے ہو
وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو
اور وہ جس سے تم پناہ مانگتے ہو
یہ چیزیں تمہاری ہستی میں روشنی اور سایہ کی طرح
باہم موجود ہیں
جب سایہ غائب ہو جاتا ہے
تو روشنی ایک اور روشنی کا سایہ بن جاتی ہے۔
اور جب آزادی کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں
تو وہ ایک عظیم تر آزادی کے لئے زنجیر بن
جاتی ہے۔

عطاء اللہ کلیم

جن چیزوں میں سچائی ہے، جن چیزوں میں دیانت داری ہے، جن چیزوں میں پاکیزگی ہے، جن چیزوں میں خوبصورتی ہے، جن چیزوں میں نیک نامی ہے، اگر نیکی کوئی شے ہے اور اگر تعریف بھی کوئی شے ہے تو تو اِن چیزوں کی تعریف کیا کر اور انہیں اپنے دل میں جگہ دے۔

گلچیں

موت کا رقص

موت کا رقص فرانسیسی حقیقئین کے امام گستا وفلابئیر کا رقم کردہ ہے۔ اسے نثر میں ایک نظم کہا جاسکتا ہے۔ اس میں "رُوما نیت" کا رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ دراصل اس کے لکھتے وقت فلابئیر کے دل و دماغ پر رُوما نیت کا عارضی مگر مضبوط قبضہ ہو چکا تھا۔

موت

رات کے وقت کڑکڑاتے جاڑے میں جب برف بڑے بڑے سفید آنسوؤں کی طرح آسمان سے آہستہ آہستہ گرتی ہے میں اپنی آواز بلند کرتی ہوں، جس کی صدائے بازگشت سرو کے درختوں میں سنسنی دوڑا دیتی ہے۔

میں اپنے سریع السیر اور دائمی سفر میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرتی ہوں اور سرد اور تاریک قبروں میں اُتر جاتی ہوں، سیاہ پروں والے پرندے ڈر ڈر کر میرے دائیں بائیں پھڑپھڑاتے ہیں، مُردے قبروں میں آرام سے لیٹے ہوتے ہیں، بید مجنوں کی شاخیں میرے سر پر متحرک ہوتی ہیں۔ میرے چاروں طرف آہ وبکا ہوتی ہے یا کامل سکوت، میری شعلہ آفریں آنکھیں بڑے بڑے سفید بادلوں کی تہوں پر جم جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے بڑے کپڑے کے تھان کھولے اور لپیٹے جارہے ہیں،

لاتعداد سال گذر گئے۔ بے شمار عمریں ختم ہو گئیں۔ زمانہ اپنی گردشِ پیہم میں صدیوں آگے نکل گیا، مگر میرا سفر برابر جاری ہے، میری منزلِ مقصود دور سے دُور تر معلوم ہوتی ہے۔ میں دُنیا کے آغاز کی شاہد ہوں، معلوم ہوتا ہے، اس کے انجام کی شہادت بھی میری ہی تقدیر میں لکھی گئی ہے۔ میری درانتی بے اندازہ نسلوں کو موت کی تاریکیوں میں دھکیل چکی ہے۔ میں خدا کی طرح ازلی ہوں، میں نے دنیا کو اپنی آغوش میں پالا ہے۔

آہ، میرا کام کبھی ختم نہ ہوگا، مسلسل جگر کاوی، متواتر جانکاہی، نہ آغاز نہ انجام، ہر صبح میں اپنے خونی کام پر روانہ ہو جاتی ہوں اور ہر شام اپنے چوغے کی بڑی بڑی شکنوں میں لاتعداد روحوں کو چھپائے ہوئے واپس لوٹتی ہوں اور پھر اُن کو آسمانی ہواؤں کے حوالے کر دیتی ہوں۔

جب سمندر میں طوفان کی بلاخیزیاں خوفناک صورت اختیار کرلیتی ہیں، جب آسمان آنسو بہاتا ہے اور چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں کوڑے مار مار کر سمندر کو دیوانہ بنائے دیتی ہیں، میں اس شوروغل میں سرکش موجوں پر بیٹھ جاتی ہوں۔ طوفان خیز موجیں مجھے اس بلکہ کی طرح جھولا جھلاتی ہیں جو اپنے "متحرک پلنگ" پر محوِ آرام ہو۔ پانی سرد اور ٹھنڈے جھاگ سے میرے پاؤں کی جلن کو دُور کرتا ہے جن کو

لاتعداد نسلوں کے آنسوؤں نے ایک دائمی سوزش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

جب تلاطم خیز سمندر اپنی لوریاں ختم کر چکتا ہے تو میں اپنا سر جھکا دیتی ہوں، دفعتہً سمندر کی خشم انگیز موجیں آغوشِ سکون میں سو جاتی ہیں۔ اور اُس پر سکوت موت طاری ہو جاتا ہے۔ نہ وہ ہوائیں رہتی ہیں، نہ آدمی اور نہ جہاز، ہر شے سکون پذیر ہو جاتی ہے۔

اس متواتر سفر میں میں نے بہت سے بادشاہوں کو دیکھا ہے، ان کے شاہی رعب و جلال سے متاثر ہوتی ہوں، خیر و شر کے مجادلے میری آنکھوں نے دیکھے ہیں، دنیا کے آلام اور مصائب کی بھی میں گواہ ہوں مگر مجھے کیا! مجھے کسی چیز سے محبت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں مجھے صرف اپنے سیاہ فرغل سے محبت ہے، جو میرے جسم کو چھپائے رہتا ہے۔

اے میرے گھوڑے، میرے پُر جلال گھوڑے، میں تجھ سے بھی محبت کرتی ہوں۔ اور تیری تگ و دو سے بھی۔ تیرے فولادی سموں کے نیچے زخمی تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوتے ہیں، تیری دُم سیدھی اور موزون ہے، تیری آنکھیں شعلہ جوالہ کی طرح متحرک ہیں، تیری ایال ہواہیں لہراتی ہے، جب ہم اپنے دوامی سفر میں گامزن ہوتے ہیں تو نہ آرام کرتے ہیں، نہ سوتے ہیں، بے خواب و خور چلے جاتے ہیں۔ تیرا ہنہنانا جنگ کی علامت ہے، تیرے نتھنے ہوا کو ناگوار بدبُو سے معمور کر دیتے ہیں جو کہرے کی طرح زمین پر منڈلاتی رہتی ہے۔ جس طرف میرا تیر جاتا ہے، تُو سلطنتوں اور بادشاہتوں کو کچلتا ہوا اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ سب لوگ تیرا احترام کرتے ہیں نہیں بلکہ تیری پُوجا کرتے ہیں، تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے پاپائے اعظم اپنا "سہ گوشہ تاج" نذر کرتا ہے اور سلاطین اپنے شاہی عصا۔ لوگ اپنے پوشیدہ راز تیری خدمت میں پیش کرتے ہیں، اور شاعر اپنی شہرت و ناموری، سب تیری تعظیم و تکریم کرتے ہیں مگر تُو ــــــ تُو اُن کے جسموں کو روندتا ہُوا چلا جاتا ہے۔

اے اصیل گھوڑے! بلاشبہ تو بے مثل آسمانی عطیہ ہے۔ تیرے اعصاب فولاد کے ہیں اور تیرا سر کانسے کا، تُو بے اندازہ زمانے تک اپنے ختم نہ ہونے والے راستے پر عقاب کی سی سُرعت پرواز جاری رکھے گا؛ جب کبھی بھوک غلبہ کرتی ہے تو تُو انسانی گوشت کھاتا اور انسانی لہو پیتا ہے۔ اے میرے بے مثل گوہر میں تجھ سے ایسی محبت کرتی ہوں جیسی ایک زرد چہرہ عورت کر سکتی ہے۔

آہ۔ بے شمار زمانوں سے میں اِسی طرح زندہ ہوں، لاتعداد چیزوں کو دیکھ اور سمجھ چکی ہوں، خلقِ خدا کے بے شمار سربستہ راز میرے سینے میں محفوظ ہیں،

کبھی کبھی جب میں اپنے لاتعداد تیر چلا چکتی ہوں اور گھوڑے کی پیٹھ پر تمام دُنیا کی سیر کر چکتی ہوں تو ایک خستگی سی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے اور میں آرام کی ضرورت محسُوس کرتی ہوں۔

مگر ــــــ مگر میرا کام ضرور جاری رہنا چاہئے، میرے لئے مقررہ راہ پر چلتے رہنا بہت ضروری ہے کہ میرا راستہ تمام دُنیا اور فضا پر حاوی ہے میں لوگوں کے منصُوبوں اور تدبیروں کو مع اُن کے امیال و عواطف اور ہر شے کے بہالے جاتی ہوں۔

کبھی اپنے فرغل کو تار تار کر دینا چاہتی ہوں، ایک خوفناک اندرونی خواہش میرے لئے مسلسل اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے جیسے اندر ہی اندر کوئی سانپ ڈس رہا ہو۔

جب میں اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی ہوں تو سوائے برباد کھنڈروں اور گرد و غبار میں اٹے ہوئے ویرانوں کے کچھ نظر نہیں آتا حد نگاہ تک تاریکی ہی تاریکی ہے۔ لوگوں کے عذاب کے دردناک نظارے شکستہ گورستانوں کے تباہ شدہ ویرانے، یہ تمام چیزیں میں نے ہی کھو دی ہیں، میرا ماضی تمام ہیچ اور لایعنی ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے جسم ٹوٹ رہا ہے۔ میرے تھکے ہوئے پاؤں آرام کے طلبگار ہیں۔ میری آنکھیں خونیں شفق پر پڑتی ہیں، وسیع و عریض شفق پر جس کی گہرائی اور بلندی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، میں اس کو بھی کھا جاؤں گی جس طرح دوسری تمام چیزوں کو کھا چکی ہوں،

اے خدا! میرے آرام و راحت کی ساعت کب آئے گی، یہ سلسلۂ توالد و تناسل کبھی بند بھی ہو گا یا نہیں ؛ وہ دن کب آئے گا۔ جب میں اپنی قبر میں آسودہ ہونگی، اور دنیا کے جھولے میں جھولتی ہوئی دم توڑ دوں گی ؛

جب وہ وقت آئے گا میں اپنا ترکش اور فرغل پھینک دوں گی اور گھوڑے کو آزادی دے دوں گی، وہ اہرام کی بلندیوں سے گھاس چریگا۔ اور بادشاہوں کے محلوں میں سوئے گا۔ سمندر سے پانی کا آخری قطرہ تک پی لے گا۔ اور آہستہ آہستہ گرنے والے خون کی آخری بوند کی بو سونگھے گا۔ وہ دن رات بے شمار زمانوں تک جنت میں حسب مرضی بسر کرتا رہے گا۔ سوکھے ہوئے سمندروں اور اُجڑے ہوئے شہروں کو پلک جھپکنے میں پھاند جائے گا، وہ فضا کی وسعتوں میں سینہ پھلا کر سانس لیگا اور جس طرح چاہیگا لطف اندوز ہوگا

پھر، ممکن ہے، اے میرے وفادار گھوڑے، جس طرح میں خستہ و ماندہ ہوں اسی طرح تھک ہار کر تو کوئی ایسی چٹان پالے جہاں سے خود کو گرا کر دائمی ظلمتوں میں نہاں ہو جائے، بے پایاں سمندر تیرے سامنے ہو گا۔ تو منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے نتھنوں کو پھلا کر اُس کی اتھاہ گہرائیوں میں کود جائے گا، پھر تجھے سرمدی راحت نصیب ہو گی اور تیرے آتشیں سموں کو ٹھنڈک پہنچے گی، سبز پتوں کا نرم نرم بچھونا ہو گا، مگر اُس پر بھی تو برسوں راحت کی نیند نہ سو سکے گا، وہاں عین کنارے پر تو اس بات کا منتظر رہیگا کہ کوئی طاقتور ہستی ایک ہی ضرب میں تیرا کام تمام کر دے تو مرگ انبوہ کو جشن خیال کرے گا، مُردہ جسموں اور مُرجھائے ہوئے پھولوں میں تیرے لئے کشش ہو گی، تجھے خواب راحت کی تلاش ہو گی، کیونکہ ابدی زندگی ابدی اذیت ہے اور کُنج مرقد گوشۂ راحت،

ہم یہاں کیوں آئے، کونسی آندھی نے ہمیں اس گرداب بلا میں لا ڈالا ؛ وہ کون سا طوفان ہو گا، جو ہم کو انہی پُراسرار غاروں میں اُڑا لے جائے گا جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا ؛

اُس وقت تک اے میرے پرشکوہ گھوڑے تو اپنے راستے پر چلتا رہ، کھوپڑیوں کے ٹوٹنے کے تڑاخوں اور ہڈیوں کی چرک چرک کو فردوسِ گوش بنائے رکھ، تیرا سفر بہت طویل ہے۔ مگر اطمینان رکھ، تو نے مجھے بہت عرصہ سواری دی ہے، اس سے

بھی زیادہ عرصہ ابھی ہمارے بوڑھے ہونے میں باقی ہے۔

ستاروں کی قندیلیں بجھ جائیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں، زمین اپنے محور کو فرسودہ کردے۔ مگر ہم —— ہم دونوں غیر فانی ہیں۔ لاتعداد زمانوں تک ہم کو بقا حاصل ہے۔

آج تو میرے قدموں میں آرام کرسکتا ہے۔ تو مزاروں کی گھاس سے اپنے دانت صاف کرتا رہ۔ شیطان نے مجھے خیرباد کہہ دی ہے مگر ایک نامعلوم قوت مجھے اُس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو مجبور کررہی ہے، دیکھو، مردے قبروں سے اُٹھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اے شیطان مجھے تجھ سے محبت ہے، میرے جنون اور میری مسرت کو صرف تو ہی جان سکتا ہے، لیکن تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے کیونکہ ایک دن جب دنیا کالعدم ہوجائے گی تو قبر میں چین سے سوجائے گا،

مگر میں —— میں جو اتنے عرصے سے زندہ ہوں، اور متواتر کام میں مصروف ہوں، میرے خیالات ہمیشہ پاکیزہ اور میری محبت ہمیشہ خالص رہی ہے۔ میں ہی بقا کا عذاب بھی برداشت کررہی ہوں، آدمی کو قبر میسر ہے اور اپنی تاریکی میں محوِ خواب ہے۔ دن رات میں گم ہوجاتا ہے، مگر میں —— میں ——

میں اپنے دوامی راستے پر تنہا گامزن ہوں، جو انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں سے پٹا پڑا ہے، اور جہاں حسرت و عبرت برستی ہے۔ فرشتے اپنے ہمراہی فرشتے رکھتے ہیں، شیطانوں کو تاریکی کے دوست میسر ہیں مگر میں —— میں تنہا ہوں اپنی درانتی کی آواز، تیروں کی سائیں سائیں اور گھوڑے کے سموں کی ٹاپ کے سوا مجھے کچھ نہیں سنائی دیتا۔

شیطان

اے خوش نصیب ہستی، کیا تجھے بھی شکایت ہے؛ تو ہی ایک ایسی ہستی ہے جو خدا کی طرح قائم و دائم ہے۔ کوئی دوسری ہستی تیری برابری نہیں کرسکتی۔ کیا تجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ ایک دن دُنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالنے کے بعد تو بھی روند ڈالی جائیگی؛

جب خدا کا تخلیق کا کام بند ہوجائے گا، جب آسمان معدوم ہوجائیں گے اور ستاروں کی شمعیں گُل ہوجائیں گی، جب روحیں اپنے مسکنوں سے باہر آکر گریہ وزاری کرتی پھریں گی، اس وقت تیرے لئے کس قدر مقامِ مسرت ہوگا۔ پھر تو دوزخ اور بہشت کے دائمی تخت پر متمکن ہوگی، سیارے، ستارے اور دنیائیں تہ و بالا ہوجائیں گی۔ تیرا آزاد گھوڑا زمرد اور ہیرے کے کھیتوں میں محوِ خرام ہوگا، اُس کی جھول فرشتوں کے پروں کی ہوگی اور اُس کا ساز آتشیں ستاروں سے مرصع ہوگا۔ اور پھر تو اِس کو فنا کردیگی، جب تو ہر چیز کو تباہ کرچکے گی اور صرف خالی فضا رہ جائے گی۔ تیرا افرغل تار تار ہوجائے گا، تیرے تیر ٹوٹ جائیں گے، پھر تو آسمان کے بلند ترین پہاڑ کے پتھروں سے تاج بنائے گی اور غیر محدود تاریکیوں میں کود پڑے گی، تیری یہ جست صدیوں طویل ہوسکتی ہے، مگر آخر کار تو جاں بحق ہوجائے گی، کیونکہ دنیا کا انجام ضروری ہے، سب کے لئے موت لازمی ہے،

سوائے شیطان کے جو خدا سے بھی زیادہ ابدی ہے۔ میں دنیا میں نیستی اور فنا پھیلانے والا ہوں۔

موت۔ لیکن تیرے سامنے، میری طرح ایک ابدی اور لاانتہا منظر نہیں ہے، تجھے میری طرح تباہ کار برودت اور یخ بستہ فضا سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

شیطان۔ مگر میں تو پگھلے ہوئے لاوے کی دائمی اور جانسوز تپش کے نیچے کانپ رہا ہوں، یہ میری تقدیر ہی میں ہے اسکے سامنے بے بس ہوں تیرا کام لوگوں کو نیستی کے سپرد کرنا ہے، اور میرا فرض اُن کو زندگی عطا کرنا ہے۔ میں سلطنتوں کا مشیر ہوں، سیاسیاتِ ملکی میں میری تدبیروں پر عمل ہوتا ہے۔ میں دلوں کا نگہبان ہوں۔

میرا ہر جگہ موجود ہونا ضروری ہے، میرے اشاروں پر قیمتی معدنیات کے دریا بہ نکلتے ہیں۔ جواہرات کی آب و تاب دوچند ہو جاتی ہے اور لوگوں کے دل میری صدا پر لبیک کہتے ہیں۔ میں عورتوں، شاعروں اور ملکی مدبروں کے کانوں میں محبت، تعریف اور کشور کشائی کے لفظ کہتا ہوں۔ مسالینی اور نیرو کے ساتھ میں پیرس اور بابل میں بیک وقت موجود ہوتا ہوں۔ جو نیا جزیرہ دریافت ہوتا ہے، چاہے وہ پانی میں محصور چند چٹانیں ہی کیوں نہ ہوں، میرا قدم انسان کے پاؤں سے پہلے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ میں بادشاہوں کے عطر میں بسے ہوئے بستروں اور عمائدِ سلطنت کے نرم اور گرم گدیلوں میں محوِ استراحت ہوتا ہوں۔ میرے مُنہ سے غم و غصہ، حسد و رقابت، نفرت اور دشمنی کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ میرا کام کبھی ختم نہ ہوگا۔ جب عیسائیوں کو آگ میں ڈالتے ہیں میں معطر حماموں میں دادِ عیش دیتا ہوں اور رتھوں پر سوار ہوتا ہوں۔ کبھی مایوسی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے، کبھی تکبر سے میں اکڑ اکڑ چلتا ہوں۔

کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تمام دنیا میرے اندر آباد ہے اور وہ تمام واقعات جن کا میں گواہ رہ چکا ہوں دوبارہ میری ہستی میں واقع ہو رہے ہیں۔

کبھی کبھی میں تھک ہار کر عقل و خرد کو خیرباد کہہ دیتا ہوں، اور ایسی ایسی مجنونانہ غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہوں کہ میرا کمینے سے کمینہ نوکر بھی میرا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ اگرچہ اُن کو میری حالت پر رحم بھی آتا ہے۔

کسی ذی حیات ہستی کو میری پروا نہیں، نہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ نہ آسمانوں میں جو میری جنم بھومی ہیں، نہ جہنم میں جس جگہ میری سرداری مسلم ہے، نہ زمین پر جہاں لوگ مجھے دیوتا خیال کرتے ہیں، مجھے سوائے بربادیوں، تباہ کاریوں، خون کی ندیوں اور جوشِ دیوانگی کے کچھ نہیں سوجھتا، میری پلکوں کو کبھی نیند نصیب نہ ہوگی، میری رُوح کو کبھی راحت میسر نہ ہوگی مگر تُو ٹھنڈی اور راحت بخش قبر میں سو جائے گی۔ میں ابدالآباد تک محلات کی شان و شوکت سے آنکھیں سینکنے، بھوکوں کی بد دعائیں سننے اور جرائم کی عفونت سونگھنے کو زندہ رہوں گا۔

خدا نے جس سے میں بجا طور پر نفرت کرتا ہوں، مجھے کافی سزا دی ہے، مگر میری روح اُس کے خشم سے بھی بڑی ہے، ایک طویل اور گہری سانس میں میں تمام دنیا کو اپنے سینے کے اندر کھینچ سکتا ہوں جہاں وہ میری طرح ہمیشہ ہمیشہ تک جلتی رہے۔ اے میرے آقا، تیرا صورِ قیامت کب پھنکے گا؛ پھر سمندروں اور پہاڑوں پر حیوانی منڈلائے گی، آہ، کیا مجھے بھی انسانوں کے ساتھ عذاب برداشت کرنا پڑے گا؟ کیا اُن کے آہ و بکا کے شور میں میری آواز ڈوب جائے گی!

[لاتعداد انسانی ڈھانچ رتھوں پر سوار تیزی سے دوڑتے نظر آتے ہیں، فتح اور مسرت کے نعرے بلند ہوتے ہیں، وہ ٹوٹی ہوئی شاخوں اور شکستہ تاجوں کو کھینچتے آ رہے ہیں، زرد اور مرجھائے ہوئے پتے راستے کی گرد اور ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔]

دیکھو، شہرِ جاوداں یعنی رومہ کے فاتح گروہ کی طرف دیکھو؛ اُس کا کیپیٹول[1] اور کولزیم[2] اس دریائے مواج کے سامنے محض ریت کے ذرے معلوم ہوتے ہیں، لیکن موت نے اپنی درانتی کو حرکت دینا شروع کر دیا ہے، قبروں کے کتبے اور تعویذ گرے پڑتے ہیں، اُن کا کمان افسر نیرو ہے۔ میرے دل کا فخر نیرو، سب سے بڑا شاعر نیرو۔

[نیرو رتھ پر سوار ہے، بارہ گھوڑوں کے ڈھانچ اُس میں جتے ہوئے ہیں۔ اپنے عصائے شاہی سے وہ گھوڑوں کو مارتا ہے، وہ سیدھا کھڑا ہے، اُس کا لباس اُس کے پیچھے اُڑ رہا ہے، وہ مڑتا ہے، اُس کی آنکھوں سے شعلے برستے ہیں اور پوری طاقت سے چلاتا ہے۔]

نیرو

جلدی، جلدی، اور تیز، اور تیز، حتےٰ کہ تمہارے پاؤں سے پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر چنگاریاں نکلنے لگیں اور تمہارے نتھنے تمہاری چھاتیوں کو جھاگ سے آلودہ کرنے لگیں، کیا ابھی تک پہیوں سے دھواں نہیں اُٹھنے لگا؟ اے شہنائی اور نفیری والو، تمہاری آوازیں اوسٹیا[3] تک پہنچ رہی ہیں، مسرت کے نعرے اور تالیوں کا غل غپاڑا آسمان تک جاتا ہے۔ دیکھو دنیا کس طرح مجھ پر زعفران نچھاور کر رہی ہے، میرے راستے میں عطر اور گلاب لنڈھائے گئے ہیں۔ میرا رتھ ہوا کے کندھوں پر سوار اُڑا چلا جا رہا ہے، تیز — اور تیز — گرد و غبار کے بادل اُٹھ رہے ہیں، میرا ملبوسِ شاہی ہوا کی موجوں

---

[1] روما کا ایک مندر جو کیپی ٹولین چٹان پر بنا ہوا ہے۔ یہ جیوپیٹر کے نام سے منسوب ہے۔

[2] روما کا ایک بہت بڑا اکھاڑہ اور تماشاگاہ۔

[3] دریائے طیبر کی ایک مشہور بندرگاہ۔

پر لہرا رہا ہے، اُس سے فتح و نصرت کی صدائیں نکلتی معلوم ہوتی ہیں، تیز، اور تیز ـــــ نعرہ ہائے مسرت کی گونج کو سنو، گھوڑوں کے پاؤں کی ٹاپ اور لوگوں کی تحسین و آفریں کے غل غپاڑے پر کان دھرو، جوپیٹر دیوتا خود آسمانی کھڑکیوں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ تیز، اور تیز ـــــ

نیرو کا رتھ اب جنات کے کندھوں پر معلوم ہوتا ہے، دھوئیں اور گرد کے تاریک پردے اُسے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں، وہ اپنے تیز رفتار رتھ پر قبرستانوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ جاگے ہوئے مردے دوبارہ پہیوں کے نیچے کچلے جا رہے ہیں، وہ آگے آتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔

نیرو

اب چھ سو کنیزوں کو میرے سامنے "خاموش یونانی رقص" کرنے دو، میں سنگِ سماق کے خوبصورت حوض میں آرام کروں گا، وہ میرے گرد کھڑی ہو کر حلقہ باندھ لیں، ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے تاکہ میں خود کو سفید سنگِ مرمر کی سی رعنائیوں میں محصور محسوس کروں۔ میں اپنی سلطنت، اپنا تاج و تخت اُس عورت کے حوالے کر دوں گا جو شوقِ بے حد سے مجھ سے ہم آغوش ہو، جس کا دل میرے دل کے نیچے دھڑکتا رہے، جو مجھے اپنے گیسوؤں کے عنبریں دام کے اُلجھاؤ میں گرفتار کر لے، جو محبت کے گیت سنائے، جس کے تبسم میں بجلیاں آسودہ ہوں، میں مسرت کے بحرِ ناپید اکنار میں تیرنا چاہتا ہوں۔

آج کی رات روما پر سکوت طاری رہے گا۔ کوئی کشتی طیبر کے کناروں کے ساتھ لگی نہ رہے گی، کیونکہ میں اس کی پُرسکون سطح پر چاند کی رو پہلی کرنوں کو دیکھنا اور حُسن کی ضیا باریوں سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔ خوشبوؤں میں لدی ہوئی ہواؤں کو میرے پاس سے گزرنے دو۔ آہ! کیا میں نشہ میں سرشار موت کا شکار بن جاؤں گا؟

پھر، جب میں کھانے کے دسترخوان پر بیٹھوں تو اُن میں سے ایک کو گانے دو، دوسری کنیزوں کو میرے لئے سونے کی طشتریوں میں کھانا لانے دو۔ وہ مجھے محوِ آرام دیکھتی رہیں، ایک کنیز دفعتہً دوسری کا گلا کاٹ دے، کیونکہ یہ میری خوشی ہے میری مسرت ـــــ میں جو دیوتاؤں کا منظورِ نظر ہوں، مظلوموں کی آہ و بکا میں ہے۔ یہ مجھے راحت بخشتی ہے۔ میں خوراک کے ساتھ لہو ملانا پسند کرتا ہوں۔

آج میں روما کو نذرِ آتش کر دوں گا، شعلے آسمان کو منور کر دیں گے اور دریائے طیبر آتشیں موجوں میں کروٹیں لے گا، پھر میں اعلےٰ قسم کی لکڑی کا "تختِ رواں" تیار کراؤں گا، جو رومن سمندر پر تیرے گا اور رومن آبادی میری مدح و ثنا کے گیت گانے کے لئے جمع ہو جائے گی۔ میرے تخت کے پردے سنہرے ہوں گے، اور اس پر میں عقاب کے پروں کا بستر بچھا کر بیٹھوں گا، میرے پہلو میں حسین ترین عورت ہوگی، دنیا اس دیوتا کی ظفرمندیوں پر خوشی کے پھول برسائے گی،

اگرچہ میرے اردگرد شور و غل کا سمندر موجزن ہوگا، مگر میرے پاؤں کے نیچے اُس کا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور باجوں اور شہنائیوں کی صدائیں موجوں کے شورِ بے ہنگام پر غالب آجائیں گی،

تم نے کیا کہا ؛ وِنڈیکس باغی ہوگیا ؛ عمائدِ سلطنت بھاگ گئے ؛ میری کنیزیں خوف سے چھپتی پھر رہی ہیں ؛ صرف خاموشی اور آنسو باقی ہیں۔ سوائے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کے کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ کیا میری موت کا وقت قریب آپہنچا ہے ؛

مُوت۔ ہاں۔ فوراً مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ،

نیرو۔ کیا میں مسرت و ابتہاج کی محفلوں کو خیرباد کہہ دوں ؛ کیا میرے رتھ، لوگوں کی تحسین و آفریں اور تمام عیش و نشاط مجھ سے چھِن جائے گا ؛

مُوت۔ ہاں۔ سب کچھ، سب کچھ،

شیطان۔ جلدی کرو، دنیا کے آقا، وہ ہستی آرہی ہے جو ایک ہی ضرب میں آپ کا کام تمام کردے گی، شاہنشاہ مرنے سے واقف ہوتا ہے !

نیرو۔ کیا میں جان دے دوں ؛ ابھی تو میں نے زندگی شروع ہی کی ہے، ابھی کتنے ہی بڑے بڑے کام تشنۂ تکمیل ہیں وہ کام جو اولمپس کو لرزے میں ڈال دیں۔

مَیں سمندر کو بھر کر اُس پر اپنی گاڑی چلاؤں گا۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں طیبر کی سنہری ریت اور شاندار عمارات کی دید سے ابھی سیر نہیں ہُوا،

مُوت۔ مَیں تیرے مقبرے کے لئے غلاف دوں گی، اور ایک ایسا بستر جو بادشاہی بچھونوں اور گدیلوں سے بھی پُرلطف اور راحت بخش ہوگا۔

نیرو۔ مَیں اس پر بھی جان دینے کو تیار نہیں ہوں،

مُوت۔ اگر ایسا ہے تو لے، تو گیا۔

[وہ زغل اُٹھاتی ہے، جو پاس ہی زمین پر پڑا ہے۔ اور اُس میں لپیٹ کر نیرو کو لے جاتی ہے۔]

سالک صہبائی

نواہائے راز

کبھی جنت میں بہلایا گیا ہوں
کبھی دوزخ میں جلوایا گیا ہوں

کہاں میں اور کہاں آدابِ محفل
جہاں پہنچا نکلوایا گیا ہوں

مری طفلی ہے اور یہ دست خوش ہے
دو عالم دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ کیسا امتیازِ کفر و دیں ہے
عبث جھگڑوں میں اُلجھایا گیا ہوں

غلط ہے مجھ پہ تہمت زندگی کی
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

میں ہوں وہ قطرۂ باراں کہ تنہا
جلی مٹی پہ برسایا گیا ہوں

مرا قصہ بھلا دے زندگی کاش
پُرانی بات ہوں آیا گیا ہوں

حامد علی خاں

محفلِ ادب

خسر اور داماد

(مصری افسانہ)

دوشیزہ۔ ابا سے ملو اور مجھ سے شادی کی باضابطہ درخواست اُن کے سامنے پیش کرو۔

نوجوان۔ باضابطہ! لیکن پیاری تم جانتی ہو کہ میں بہت شرمیلا ہوں اور ذرا میں ہاتھ پاؤں بھول جاتے ہیں۔ تمہارے والد سے ملاقات کا خیال ہی میرے حواس گُم کر دیتا ہے۔ میں اُن سے کیا کہوں گا؟ کس طرح بات شروع کروں گا؟

دوشیزہ۔ گھبراتے کیوں ہو؟ میرے ابا بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ . . . . جب اُنہیں تمہاری غرض معلوم ہوگی تو بہت خوش ہونگے۔

نوجوان۔ لیکن میں اُن سے کیا کہوں گا؟

دوشیزہ۔ تم اُن سے کہنا کہ میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے . . . . .

نوجوان۔ یعنی پہلے السلام علیکم نہ کہوں؟

دوشیزہ۔ ظاہر ہے پہلے سلام ہی کرنا ہوگا وہ تمہارے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے تب تم . . . .

نوجوان۔ کیا مجھے اُن کے قریب بیٹھ جانا چاہئے۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اس مہم کو تم ہی سر کردو۔

دوشیزہ۔ نہیں، یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے لیکن میں تمہیں وہ سب باتیں یاد کرائے دیتی ہوں جو ابا سے کہنا ہوں گی۔

نوجوان۔ اگر وہ مجھے نکال دیں؟

دوشیزہ۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو بے حد خوش ہوں گے۔ اچھا تم اُن سے پہلے کہنا السلام وعلیکم۔

نوجوان۔ السلام علیکم! السلام علیکم!

دوشیزہ۔ جب وہ سلام کا جواب دیں تو تم کسی کرسی پر بیٹھ جانا۔ اگر شرم غالب آجائے تو سر جھکا لینا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ابا بھی سر جھکا کر بیٹھیں گے۔

نوجوان۔ السلام علیکم! السلام علیکم!

دوشیزہ ۔ جب بیٹھ چکنا تو کہنا ، میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے . . . . .

نوجوان ۔ میں اِس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے . . . . .

دوشیزہ ۔ یہ عرض کروں کہ مجھے اپنی دامادی سے مشرف کریں ۔

نوجوان ۔ یہ عرض کروں کہ مجھے اپنی دامادی سے مشرف کریں ۔

دوشیزہ ۔ دیکھو ، جب یہ کہنا تو دل مضبوط رکھنا ، پیشانی پر پسینہ نہ آنے پائے ۔ بہادر بنو ۔ پانچ منٹ میں سب کچھ طے ہو جائیگا ۔ پھر میرے ابّا بہت ہی اچھے آدمی ہیں ۔ تم خود ہی دیکھ لوگے ۔

نوجوان ۔ اور کیا کہوں گا ؟

دوشیزہ ۔ وہ تمہیں جواب دیں گے کہ تم کو داماد بنانا میرے لئے عزت کی بات ہے ۔

نوجوان ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ یہی کہیں گے ؟

دوشیزہ ۔ ہاں حق الیقین ہے ۔

نوجوان ۔ پھر ؟

دوشیزہ ۔ وہ تم سے تمہارا اور تمہارے والد کا نام پوچھیں گے ۔ تمہارے باپ مشہور آدمی ہیں ۔ اُن کا نام سُن کر خوش ہو جائیں گے پھر وہ تمہارے سامنے سگریٹ پیش کریں گے اور چائے منگائیں گے ۔

نوجوان ۔ لیکن میں نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ چائے ۔

دوشیزہ ۔ یہ تم اُن سے کہہ دینا ۔ وہ تمہاری اور زیادہ قدر کریں گے ۔

نوجوان ۔ اچھا تو میں یاد کرتا ہوں ۔ السلام علیکم ، میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ . . . . . یعنی . . . . کہ . . . . یعنی . . . . .

دوشیزہ ۔ تم بھول گئے ۔ خیر میں پوری بات لکھے دیتی ہوں . . . . . اس وقت سے شام تک یاد کرلینا ۔

(۲)

شام کو جب حسن آفندی کپڑے اُتارنے لگے تو اُن کی بیوی نے کہا :۔

بیوی ۔ ذرا ٹھہرو ۔ ابھی کپڑے نہ اُتارو ۔

شوہر ۔ کیوں ؟

بیوی ۔ ابھی ایک نوجوان آئے گا جو ہماری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔

شوہر ۔ پانچوں میں سے کس لڑکی سے ؟

بیوی۔ فاطمہ سے۔

شوہر۔ خود میں بھی یہی سمجھتا تھا کیونکہ فاطمہ اپنی سب بہنوں سے زیادہ چنچل ہے۔ لیکن نوجوان مجھ سے کیوں ملے۔ تم کہہ دینا کہ رشتہ مجھے منظور ہے۔

بیوی۔ یہ تم کیا کہتے ہو۔ تم سے اُس کا ملنا ضروری ہے۔ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ لڑکا بہت شرمیلا ہے۔ تمہاری ملاقات سے ڈرتا ہے۔ اِسی لئے فاطمہ نے اس کاغذ پر وہ سب باتیں لکھ دی ہیں جو تمہیں اُس سے کہنا چاہئیں۔

حسن آفندی نے کاغذ اپنی بیوی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اُس میں حسب ذیل سطریں لکھی تھیں:۔

"وعلیکم السلام"۔

"تم کو داماد بنانا میرے لئے عزت کی بات ہے"۔

"براہ مہربانی اپنے اور اپنے والد کے نام سے مجھے آگاہ کرو"۔

"تمہارے والد کا میں نے نام سُنا ہے اور میں نہایت خوش ہوں کہ تمہارے خاندان سے رشتہ جوڑوں"۔

"سگریٹ حاضر ہے۔ چائے منگاتا ہوں"۔

"یہ تو بہت ہی خوب ہے کہ تم نہ سگریٹ پیتے ہو نہ چائے"۔

"مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی تمہارے گھر میں خوشی کی زندگی بسر کرے گی"۔

"ہاں میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے جیسے لائق نوجوان کو داماد بنا کر میں کبھی نادم نہیں ہوں گا"۔

(۳)

دوشیزہ۔ پیارے تم آ گئے۔ ابا تمہارے منتظر ہیں ..... کیا تم نے وہ باتیں یاد کر لیں؟

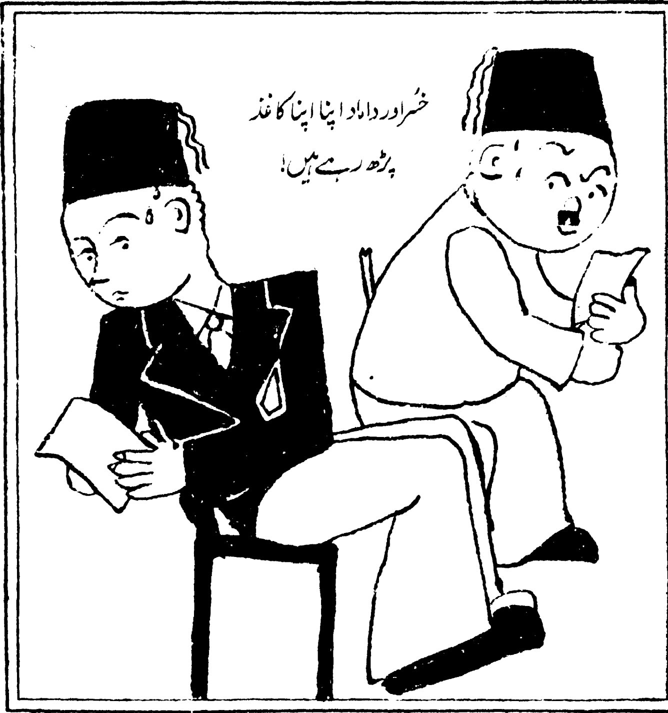
نوجوان۔ ہاں، سنو ـــــ السلام علیکم۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے ..... یعنی کہ آپ سے ..... یعنی کہ آپ سے ..... ـــــ لاحول ولاقوۃ کچھ یاد نہیں رہا۔ دیکھوں وہ کاغذ کہاں ہے؟

دوشیزہ۔ خیر کوئی ہرج نہیں۔ ابا سے ملاقات کے وقت تم کاغذ ہاتھ میں لے لینا اور وہ سب باتیں کہہ دینا۔ ابا تمہیں دیکھیں گے نہیں کیونکہ سر جھکائے بیٹھے ہوں گے۔

نوجوان۔ کیا تمہیں اس کا یقین ہے؟

دوشیزہ۔ ہاں، اماں نے مجھ سے اس کا وعدہ کر لیا ہے۔

(۴)



نوجوان ۔ السلام علیکم ۔
حسن آفندی ۔ وعلیکم السلام
نوجوان ۔ میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے . . . . .
حسن آفندی نے جیب سے کاغذ نکال کر جواب تلاش کرنا شروع کیا ۔ نوجوان نے بھی اپنی جیب سے کاغذ نکال لیا اور اس طرح پڑھنے لگا :۔
"میرا نام ابراہیم ہے میرے والد کا نام نورالدین ہے ۔ شکریہ ۔ میں نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ چائے ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی لڑکی میرے ساتھ نہایت مسرت کی زندگی بسر کرے گی ۔ آپ مجھے داماد بنا کر ہرگز نادم نہیں ہونگے !"

نوجوان کے چُپ ہوتے ہی حسن آفندی نے اپنا کاغذ بھی اس طرح پڑھ دیا :۔

"تم کو داماد بنانا میرے لئے عزّت کی بات ہے ۔ براہِ مہربانی اپنے اور اپنے والد کے نام سے مجھے آگاہ کرو ۔ تمہارے والد کا نام میں نے سُنا ہے اور میں نہایت خوش ہوں کہ تمہارے معزز خاندان سے رشتہ جوڑوں ۔ سگریٹ حاضر ہے ، چائے منگاتا ہوں ، یہ تو بہت ہی خوب ہے کہ تم نہ سگریٹ پیتے ہو نہ چائے ۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی تمہارے گھر میں خوشی کی زندگی بسر کرے گی ۔ ہاں میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے جیسے لائق نوجوان کو داماد بنا کر میں کبھی نادم نہیں ہوں گا !" ۔

(ہند)

رُباعیات

گُل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک ۔۔۔ جُنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی ہمیسری کا دَر ہے مسدود ۔۔۔ قُدرت کی ہمیسری ہے جاری اب تک

کیا شیخ ، ملے گا گل فشانی کر کے | تشریحِ مآلِ شادمانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں! | جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

وہ رات گئے شراب ڈھلنا ہے ہے | وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر | آنکھوں کو ہتیلیوں سے ملنا ہے ہے

(جوش)

ہے کفر گناہ، اور اسلام گناہ | یہ کام گناہ، اور وہ کام گناہ
القصہ ہر اک چیز کا اس دنیا میں | اک نام کچھ اور ہے اور اک نام گناہ

(سیماب)

"کلیم"

اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

ہمارے ادبیات میں ہے کیا! وہی روایتی، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے۔ وہی ناروا قناعت اور ترکِ دنیا کے چبائے ہوئے نوالے۔ وہی "اگر شہ روز را گوید شب است ایں" کی غلامانہ تعلیم۔ وہی "ما مقیمانِ کوئے دلداریم" کی لوریاں وہی "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کی بزدلی۔ وہی "رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا" کی کھنچ وشیاں۔ وہی "یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا" کی لولی لنگڑی۔ وہی "ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی "نے شب وصل خیر بھی کاٹی" کی بے غیرتیاں۔ وہی "ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو" کی سوقیانہ بول چال۔ وہی "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے" کی زبوں ہمتی۔ وہی "کارسازِ مابفکرِ کارِ ما" کی نوم آور دوائیں۔ اور وہی "بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میر بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے" کی نسائی ناچاریاں۔

بری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیجیے کیا ہم اس رانڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں!

جس شاعری کی ہڈیاں، زنداں کی زنجیروں سے کھرچ کھرچ کر نکالی جاتی ہوں، جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں، جو حقیقی حسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اس زندگی اور اس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو جس کے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہوں، جسے ہر بازاری آدمی، اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے، دھکے دے کر بزم سے نکال سکتا ہو، جو دل کا جنازہ ہتیلی پر لئے پھرتی ہو، جس کی سانس سے تشنگی کا پھوڑا رِستا ہو!

ہو، جس کا ہر روز "عشرۂ محرم" اور جس کی ہر شب "شبِ شہادت" کے مانند ہو، اور جس کی تھرتھراتی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آندھی کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گزر رہی ہے، کیا ایسی فاقوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی، کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہات رکھ کر ہم زندگی کے پُرہول و ناہموار میدانوں کو طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں ؛ ایک بار نہیں، ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں میں نے اُردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھول کر دیکھے، میں نے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعراء کی نبضوں پر ہات رکھ کر ان کے ضربات کا شمار کیا، لیکن افسوس کہ مجھے ان کے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی گونجتی ہر قدم پر مچلتی، اور اُبھرتی ہوئی سُرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول، اور افسانے زہریلے کُرّے ہیں، جہاں حیات کا خون جم جاتا ہے اور ولولوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں، کس کس بات کا ماتم کروں ؛ ذرا اپنے "شعرائے کرام" کے تخلّص ہی ملاحظہ فرمایئے اور کسی ماہرِ نفسیات سے دریافت فرمایئے کہ یہ تخلّص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اُس کا جواب کیا ہوگا ؛

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلّص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکی، اور جن کی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔

سُنیئے اور عبرت کے کانوں سے سُنیئے :۔

مجروح، تُفتہ، مَلول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، بیدم، بیدل، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق وغیرہ! اور لگے ہاتھوں اِن شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے اُن سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رُسوا، کمترین، فدوی، عبدِ ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترینِ خلائق، اذلِ مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچمداں، گُناہگار، عاصی، پُرمعاصی اور روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار ہیں ؛

آخر صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے، علیل ہے، خوابیدہ ہے، مُقلد ہے، نقال ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے، مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغدار، مفلوج کی طرح اپاہج اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے ؛

ہاں میں آپ کے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں، نہ میں غدار ہوں، نہ خدانخواستہ مغرب زدہ ـــــ ایسا معلوم

تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہنا اور سمجھنا جانتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظریں اپنی شاعری کے اُن ترآزیے اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دِلوں میں اُتر جاتے ہیں لیکن آپ کو غالباً ایک شاعر کی زبان سے یہ سن کر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سرِدست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ "دل" دماغ پر غلبہ حاصل کیئے رہے۔

حول" ایشیا کا بہت پُرانا اور ہر دلعزیز فرمانروا ہے لیکن حالاتِ موجودہ کی عمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں اور عصرِ حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شریف اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں عرض کروں گا کہ براہِ خسروانہ تھوڑے دن کے لئے، تاج و تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کردے۔

ہر چند یہ مشورہ دیتے ہوئے "دل را بدل رہیست" کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے، لیکن زندگی کی ضرورتیں جب ہٹ پر آجاتی ہیں، تو ان کے قدموں پر دل و جان دونوں کو نچھاور کردینا پڑتا ہے۔ اور اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دِل ہی کی قربانی کیلئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا واقعی آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے، دانے دانے کو ترس رہا ہے؛

کیا آپ کے علم میں یہ اب تک نہیں آیا ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں، بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں؛

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؛

کیا آپ نہیں دیکھتے، آپ کی عورتیں مدقوق، جاہل اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں۔

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپ کے نوجوانوں کے چہرے اُترے ہوئے ہیں، جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؛

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی اس لمحے تک خبر نہیں ہے کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ممالک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں؛

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی؛ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرتناک حد تک پست ہے؛

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ ع "با درد بساز دہیچ درماں مطلب" پر عمل پیرا ہو کر، ان تمام تذلیلوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؛ خیر، یہ صحیح ہو یا غلط ——— میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے حساس، خوددار اور غیور ہوا کرتے ہیں، اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو ہو کر گڑگڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کرکے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خلاف آشام ساتوں

سے چھڑا لیجئے، جلد چھڑا لیجئے ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑا لیجئے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس، فوج در فوج، اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے ایک صحیح جنبش قلم، ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے، جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے ورنہ :۔

کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؛ سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؛

(جوش)

"کلیم"

دادی پوتی

ڈاڈی اماں ڈاڈی اماں تم کدھر ہے؟

دادی۔ (غور سے دیکھ کر) "آؤ بیٹی فریدہ"

پوتی۔ "ڈاڈی اماں! فریڈہ مسٹ بولو مس فریڈہ ریاض علی بولو"

دادی۔ "بیٹی ریاض علی تو تیرے باپ کا نام ہے۔ تو کب سے ریاض علی ہو گئی؟"

پوتی۔ "تم پرانا ہو گیا تمہاری اکھل بھی کھراب ہو گئی تم یہ نہیں سمجھ سکتا۔"

دادی۔ "سچ کہتی ہے بیٹی میری عقل خراب ہو گئی ہے (متعجب ہو کر) یہ کیا میری بیٹی تیرے ہونٹ اور گلے اس قدر سرخ کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا کہیں چوٹ لگ گئی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی چیز کی رگڑ لگی ہے۔"

پوتی۔ "تم نہیں جانتا ڈاڈی اماں! اس کو ارنڈ ویس سرکھی بولتے ہیں۔ تم پان کھاتا ہے۔ ہم پان کھا کر ڈانٹ کھراب نہیں کرتا یہ کھوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے۔"

دادی۔ (کچھ پریشان سی ہو کر) "اے ہے فریدہ۔ تیرے بالوں کو کیا ہو گیا! کیا میری بچی کچھ بیمار ہو گئی تھی؟"

پوتی۔ "ڈاڈی اماں تم کو کیا ہو گیا ہے، جانوروں کے دُم ہوتی ہے انڈین عورتوں نے بھی کٹے بال کے موافق اپنی دُم بنا لی ہے ہم جانور تھوڑی ہے جو دُم لگائے۔"

دادی۔ "ہاں بیٹی تو جو کہے وہ ٹھیک ہے۔ عورتوں کی خوبصورتی ہی بالوں سے ہے لیکن تو چوٹی کو دُم کہتی ہے (پوتی کو سردی سے کانپتا دیکھ کر) اچھی میری بچی! یہ تو نے کیسا ننگا لباس پہنا ہے۔ اُو بغلیں تک کھلی ہیں۔ سردی کا یہ عالم ہے کہ خون جما جا رہا ہے اور تو یہ باریک کرتی سی پہنے ہے!!"

بڑی بی لپک کر جاتی ہیں اور صندوق میں سے اپنی روئی کی صدری لاتی ہیں۔ "لے بیٹی یہ پہن لے ابھی گرم ہو جائے گی۔"

پوتی۔ (غصہ سے دیکھ کر) "ڈاڈی اماں تم نے ہمارا ناک میں دُم کر دیا اسی لئے تو ہم تم لوگوں سے ملنے میں گھبراتا ہے۔ بس اب ہم جاتا ہے اور آئندہ کبھی تمہارے پاس نہیں آئے گا۔"

دادی۔ (پوتی کو جاتا دیکھ کر) "ارے میری بچی یہ نکیلی جوتی کس نے تجھے لا دی۔ لے میری جوتی پہن جا۔ چاہے واپس مت کریو۔ اری دیوانی گر جائے گی۔"

دادی ایک ہاتھ میں جوتی اور دوسرے ہاتھ میں صدری لئے ہوئے پوتی کے ہر ہر قدم پر الٰہی خیر الٰہی خیر کی ضربیں لگاتی ہوئی دوڑتی ہیں۔ پوتی بسم اللہ اور الٰہی خیر کی آواز سن کر اپنی جوتی کی طرف دیکھتی ہوئی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی کار میں بیٹھ چلی جاتی ہے۔

(آمنہ نازلی)

نسمت

A1 966

مطبوعات

مرحوم دہلی کالج - یہ جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کا وہ طویل اور دلچسپ مضمون ہے جو "اردو" کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا اور اب کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکا ہے۔ یہ دہلی کالج کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ غدر کے بعد ہماری ادبیات کی جامع اور پر از معلومات تاریخ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی ترقی اور نشو و نما کے متعلق اس میں بہت سی بیش قیمت معلومات درج ہیں۔ آپ کتاب میں ان ہندو اور مسلمان ادبا کے متعلق بھی مختصر اشارات ہیں جن میں سے اکثر نے غدر کے بعد ہماری زبان کو بچایا اور جنہوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ قیمت عہ، پتا:- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

اردو کا پہلا ناول نگار مصنفہ ادیب احمد صاحب ادیب بی اے آنرز۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے انعام کی مستحق قرار دی گئی تھی۔ مصنف کے نزدیک اردو کے پہلے ناول نگار مولانا نذیر احمد مرحوم ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ موجودہ کتاب میں مولانا کے حالات زندگی، انکے ناولوں کا تذکرہ اور ان پر تنقید درج کی گئی ہے کتاب قابل قدر ہے۔ قیمت عہ، پتا:- مسٹر ادیب احمد ادیب، مادھو گنج، کٹرہ روڈ۔ الہ آباد۔

بہاء اللہ اور عصر جدید مصنفہ جے۔ ای۔ اسیلمنٹ مترجمہ جناب عباس علی صاحب بی اے۔ یہ بابی تحریک اور اس کی ابتدا و ارتقا کے متعلق ایک جامع کتاب ہے۔ اس میں بہاء اللہ کی پیدائش زندگی اور تعلیم سے بہت سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت عہ پتا:- دفتر بہائی میگزین کشمیر بلڈنگ لاہور۔

چند تنقیدی مضامین مصنفہ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ریسرچ سکالر الہ آباد یونیورسٹی۔ جناب حامد حسن صاحب اردو ادب کے نوجوان نقادوں کی صف اولیں میں جگہ رکھتے ہیں ان کا ایک مضمون "منظر نگاری کی ابتدائی ترقی مصور قدرت میر حسن تک" "ہمایوں" میں بھی چھپ چکا ہے۔ موجودہ کتاب میں اس مضمون کے علاوہ حسب ذیل مضامین درج ہیں:- رہنمایان سالیب، نواب محسن الملک کا انداز بیان، ناول کیا ہے، رسوا کا ایک ناول (امراؤ جان ادا)۔ سب مضامین پڑھنے کے قابل ہیں مصنف سے نمبر ۱۲ بیلی روڈ الہ آباد کے پتے سے منگائیے قیمت درج نہیں۔

آیات وجدانی - یہ جناب مرزا یگانہ چنگیزی صاحب کے مجموعہ کلام کا دوسرا ایڈیشن ہے جو بہت اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ دوسری مرتبہ شائع ہوا ہے۔ مرزا یاس مشہور قادر الکلام شاعر ہیں اور فن عروض میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ انکے کلام سے اردو رسائل کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں اسلئے موجودہ کتاب ہر قسم کے اظہار رائے سے بے نیاز ہے قیمت مجلد عہ۔ اردو بک سٹال لوہاری دروازہ لاہور سے طلب کیجئے۔

حقیقت جاپان - یہ شیخ بدر الاسلام صاحب فضلی بی اے علیگ کی دلچسپ اور مفید کتاب ہے جو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے شائع کی ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ سیاحت سے متعلق ہے جس میں جاپان کے قابل دید مقامات اور شہروں کا ذکر ہے دوسرے حصے میں جاپان کے تمدن اور [illegible]

ہندو اخلاقیات۔ مصنفہ جی لے چنداورکر بی اے مترجمہ جناب مولوی غلام جیلانی صاحب۔ اس کتاب میں ہندوؤں کی قدیم تاریخی اور مذہبی کتابوں کے حوالے سے اُن کی اخلاقیات پر بالغ نظرانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب بہت پُراز معلومات ہے اور مطالعہ کے قابل ہے قیمت عہ ۱۲ر
پتا:۔ پروہیت اینڈ کو کتب فروش ریزیڈنسی بازار حیدرآباد دکن۔

تنقیداتِ عبدالحق۔ یہ اُردو زبان کے محسن مولوی عبدالحق صاحب معتمدِ انجمن ترقی اردو کی اُن چوبیس ناقدانہ تحریروں کا مجموعہ ہے جو مختلف کتابوں کے متعلق صاحبِ موصوف کے قلم سے اُن کے سہ ماہی رسالے اردو میں شائع ہوتی رہیں۔ گویا اس طرح یہ کتاب صرف اردو کی بہت قابلِ ذکر کتابوں سے تعارف کراتی ہے بلکہ ایک مسلم نقادِ ادب کی پُراز معلومات آرا اور طریقۂ اظہار سے بھی روشناس کرتی ہے۔ قیمت عہ۔ پتا:۔ کاشانۂ ناز۔ بازار گھانسی حیدرآباد دکن۔

رسائل

کلیم۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا ماہوار رسالہ "کلیم" جس کا اہلِ ادب کو بیتابی سے انتظار تھا آخر شائع ہوگیا۔ پہلا پرچہ جنوری ۱۹۳۶ء کا ہے جو بڑی تقطیع کے ۶۰ صفحات پر دلکش سرورق کے ساتھ دبیز کاغذ پر بہ حسن اہتمام طبع ہوا ہے۔ مضمون نگاروں میں علامہ کیفی دہلوی، منشی پریم چند، اور حضرتِ سیماب اکبرآبادی کے علاوہ بہت سے دیگر بلند پایہ ادبا کے نام شامل ہیں۔ خود حضرت جوش نے "اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک ہنگامہ خیز مضمون لکھا ہے جس کا کچھ اقتباس "ہمایوں" کی موجودہ اشاعت کے بزمِ محفلِ ادب میں درج ہے۔ یہ مضمون دراصل کلیم کے مقاصدِ اجرا کی کلید ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرتِ جوش کا ہمہ گیر اثر اور اُن کی انقلاب انگیز تحریریں اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں گی جس سے ہماری سیاست و معاشرت یکساں متاثر ہوگی۔ موجودہ پرچے میں "اردو کی تنظیم"، "قومی اتحاد کیونکر ہوسکتا ہے"، "غزل گوئی"، "بال جبریل پر ایک نظر" وغیرہ قابلِ قدر مضامین ہیں۔ نظم کا معیار بھی قدرتاً بلند ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس پرچے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔
چندہ سالانہ دس روپے۔ پتا:۔ منیجر "کلیم" دہلی۔

فاران۔ یہ پرچہ مولوی محمد مجید حسن صاحب مالک مدینہ بجنور نے جاری کیا ہے اور اپنے مخصوص مباحث کے اعتبار سے عام ادبی رسائل سے الگ روش پر چلتا ہے۔ عام موضوعات، مذہبی و تاریخی مباحث اور اُن کے ساتھ سیاست کی کچھ ملونی بھی ہے۔ یہ رسالہ قابلِ قدر ہے۔ پتا:۔ منیجر فاران بجنور

عربک کالج میگزین۔ دہلی۔ مرتبہ جناب صادق الخیری صاحب دہلوی۔ یہ کالج کا رسالہ ہے لیکن حسن ترتیب اور معیار کے لحاظ سے اچھے ادبی رسائل کا ہم پایہ ہے۔ اس کامیابی کیلئے صادق الخیری صاحب مستحق مبارکباد ہیں ٭

تصاویر

روح اور بدی

یہ تصویر جیمز کلارک کی صناعی کا نمونہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ انسانی روح جو الوہیت کے خواب دیکھتی ہے اور پستی سے پہلے بلندی کی طرف جانا چاہتی ہے دنیا کی آلودگیوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی ہے اور رفعت کی ان چوٹیوں پر نہیں پہنچ سکتی جن پر اس کی نظر ہے۔ روح زندگی اور امن کی تلاش میں ہے لیکن بدی اُسے اپنے زبردست ہاتھوں سے پستی موت اور بے اطمینانی کی طرف کھینچ رہی ہے۔

ہٹلر اور مسولینی

موجودہ تصویر میں جرمنی کا مختار مطلق ہٹلر اپنے نازی گروہ میں کھڑا ہوا زندہ دل نظر آرہا ہے لیکن یہ زندہ دلی صرف اپنوں کیلئے ہے۔ یہ زندہ دل شخص دوسروں اور بالخصوص یہودیوں کے لئے قہر الٰہی سے کم ثابت نہیں ہوا۔ اس کے مقابلہ میں اطالوی آمر مسولینی کی تصویر میں متانت نظر آتی ہے لیکن جب یہ متین شخص بھی اپنے فاشی گروہوں میں کھڑا ہو کر نتھنے پھلاتا اور گلا پھاڑتا ہے تو ہلاکت و بربادی کا ایک عفریت بن جاتا ہے۔

بچپن اور بڑھاپا

یہ آرٹ کی تصویریں نہیں بلکہ کیمرے کی تصاویر ہیں۔ بچے کے چہرے کی تازگی اور بوڑھے کے چہرے کی یبوست اور جھریوں کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ بچہ کی نظر بلندی کی طرف ہے۔ گویا زندگی اپنے مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہے لیکن بوڑھے کا جھکا ہوا چہرہ اور بے نور نگاہیں سفر کے خاتمے کی خبر دے رہی ہیں۔

فطری اور مصنوعی تناسب

قدرت اور انسان کے بنائے ہوئے ان ستونوں کے عمودی خطوط میں یکساں عظمت اور اسرار کی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ کیا انسان کی ہر صنعت قدرت کی کسی نہ کسی صناعی کی نقل نہیں؛

جھولا

یہ تصویر بھی فوٹوگرافی کے کمالات کا ایک نمونہ ہے۔ جھولا ہر ملک میں مقبول ہے اور قدیم ہندوستان میں تو اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ پُر اسرار جھولا ہمیں کسی نامعلوم دنیا میں لے جاتا ہے —— شاید کسی خواب کی وادی میں۔ اور جب ہم نیچے اُترتے ہیں تو گویا ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔

"ح"

ہمایوں کی سالگرہ کی خوشی میں کتابوں کا رعایتی

اعلان

اس اعلان کے بعد ۳۱ر جنوری ۱۹۳۶ء تک "ہمایوں" کے موجودہ اور نئے سال کے خریداروں کو میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" کی مشہور کتاب "طلسم زندگی" پانچ روپے کے بجائے صرف تین روپے (علاوہ محصول) میں ملے گی۔

جرائد و اکابر کی آرا

"زمیندار" لاہور۔ اردو زبان میں اس اہتمام سے شاید ہی کوئی ادبی کتاب شائع ہوئی ہو۔

"رینہ" بجنور۔ اس کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب کمشنر انبالہ۔ کتابوں کتابوں میں اگر عشق ہوتا تو میری الماری کی تمام کتابیں اس کتاب کی پیاری سی صورت پر جان دے دیتیں۔

افسانہائے عشق (مجلد و مصور)

موجودہ اعلان کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء تک خریداران "ہمایوں" کو افسانہائے عشق مجلد سنہری ۱۲ر کے بجائے عہ مع محصول میں اور غیر مجلد ایک روپیہ مع محصول میں ملے گی

زمیندار۔ ان میں سے بعض افسانے دنیا کے بہترین افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ الفاظ میں رس اور لوچ ہے اور بعض مقامات پر طبیعت ایک کیفیت اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ **معارف۔** ان افسانوں کے تراجم میں جو لطافت شیرینی اور شعریت کے ساتھ جو سلاست، سادگی روانی اور دلکشی دیکھنے میں آئی وہ اردو کے مترجمہ افسانوں میں کم دیکھنے میں آتی ہے۔

ساقی دہلی۔ اتنے برجستہ اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ انگریزی بھی اردو کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔

ادبی دنیا۔ اپنے دلکش طرز ادا سے اصل مصنفین کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

ہندوستانی الہ آباد۔ اگر پہلے سے معلوم نہ ہو تو مشکل سے اسے ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ میگزین۔ تحریر میں وہی سوز و گداز اور الفاظ کا وہی استعمال ہے۔ جو ٹیگور کو ممتاز بناتا ہے **اردو**۔ ترجمہ بہت ستھرا اور پاک صاف ہے۔

نگار۔ ترجمہ میں جتنی کامیابی حامد علی خان صاحب کو ہوئی ہے۔ وہ مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آ سکتی ہے

حامد کے سو شعر

۳۱ر جنوری ۱۹۳۶ء تک قیمت ۶ر کے بجائے چار آنے (علاوہ محصول) چکنے کاغذ پر نفیس سرورق کے ساتھ رنگین چھپی ہے۔

حضرت عدم۔ حامد کے سو شعر آپ کے بلند اور غیر فانی نظریہ محبت کی وضاحت کرنے والی ہے۔ یہ ننھی منھی حسین و جمیل کتاب بڑے بڑے مبسوط دیوانوں پر ایک طنز کامیاب ہے۔

حضرت ریاض عباسی۔ اساتذہ متقدمین کے نزدیک شعر کا معیار کمال ندرت معانی اور متاخرین کے نزدیک سحر کاری الفاظ ہے۔ حامد کے سو شعر میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔

مینجر "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور

صحافت کے ذریعہ

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنیکی

اردو زبان میں

پہلی کوشش

مصوّر نامہ "کلیم" زیرِ ادارت شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

سائز کلاں۔ تصاویر۔ سالانہ چندہ۔ ششماہی

۱۸×۲۲/۴ (آٹھ) دس روپے پانچ روپے

جس میں شاعرِ انقلاب کا تازہ بتازہ اور نو بنو کلام ہر ماہ شائع ہوتا رہے گا ہر صاحبِ عقل ہندوستانی کو جو اسکے رجحانات سے واقف ہے اسکا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری اور شدید ضرورت ہے۔ اور موجودہ تعصبات و تنگ نظری کو فنا کر کے ملک میں ایک آزاد خیال انسانی برادری کی بنیاد ڈالنا وقت کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔

اگر آپ کو اس مقصدِ عظیم سے ہمدردی ہو تو از راہِ کرم "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ہندوستان کے اربابِ نظر کا ہاتھ بٹایئے تھوس اور سنجیدہ مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومانی و رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جنوری نمبر شائع ہو چکا ہے ۴/ روانہ کر کے نمونہ طلب فرمایئے۔

مینیجر "کلیم" دہلی

شاعرِ انقلاب مصوّرِ جذبات

حضرت جوش ملیح آبادی

کی

تازہ تصانیف

پندرہ سال کے منظومات چھ جلدوں میں اگر آپ ہندوستان کے حقیقی زندہ شاعر کے الہامات سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہیں اور آپ کو عصرِ حاضر کی صحیح ترین ترجمانی کا مطالعہ مقصود ہے تو مندرجہ ذیل کتب کے خریداروں میں اپنا نام درج رجسٹر کرا لیجئے:۔

(۱) آتشکدہ ... (مشتمل بر افکار سیاسی)
(۲) گلبانگِ فطرت ... (مناظرِ قدرت)
(۳) شعر و حکمت ... (مختلف مباحث پر رباعیات)
(۴) افکار ... (حقائق و معارف)
(۵) بادۂ سرجوش (غزلیں ایسے انداز میں جن سے اردو زبان اب تک ناواقف ہے)
(۶) نقش و نگار ... (متفرق نظمیں)
(۷) روحِ ادب ... (دوسرا ایڈیشن)

جو حضرات

پہلے سے نام رجسٹر کرا لیں گے ان سے تین چوتھائی قیمت لی جائے گی

مینیجر "کلیم" دہلی

بیشمار اسناد میں سے صرف چند سندیں

مجرب و مستند ادویات

بیشمار اسناد میں سے صرف چند سندیں

ماہواری ایام کی بیقاعدگی کا جدید سائنٹیفک طریق علاج

اوورٹو

بیقاعدہ حیض کو باقاعدہ بنادیتی ہے۔ درد کو فوراً رفع کرتی ہے اور فطرتی طور پر خون کو خارج کرنے لگتی ہے اور جن عورتوں کو خون کم آتا ہے یا خون بند ہوگیا ہو یا خون دیر سے آتا ہے۔ اُن کے لئے بے حد مفید و مجرب ہے۔ دوا خانہ کی مایہ ناز چیز ہے۔
علاوہ ازیں سیلان الرحم اور مرض باؤ گولہ کے رفع کرنے کے لئے بھی تیر بہدف ثابت ہوئی ہے۔
قیمت فی شیشی ۲۵ گولی عہ علاوہ محصول ڈاک

ہر قسم کی مردانہ کمزوری کی مصدقہ دواء

وٹورین رجسٹرڈ

جسکو بیشمار ڈاکٹر و حکیم اپنے مریضوں پر استعمال کر رہے ہیں اور جسکی صحت کے سارٹیفکیٹ تواتر کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ نشوں کے استعمال سے پیدا شدہ تمام خرابیوں اور جوانی کی غلط کاریوں سے پیدا ہونیوالی تمام کمزوریوں کو دور کرکے جسم کو مضبوط و خوبصورت بناتی ہے۔ دماغ کی کمزوری، حافظہ و نظام عصبی کی خرابی کو دور کرنے کی بے مثل دوا ہے۔
قیمت ۲۸ گولی عا/ ۱۴ گولی عہ علاوہ محصولڈاک

سارٹیفکیٹ
میں نے وٹورین رجسٹرڈ کو استعمال کیا۔ اور ایک تھوڑے ہی عرصہ میں حیرت انگیز اثر ظاہر ہوا۔ یہ مردانہ کمزوریوں کی بیمثل دوا ہے۔
(دستخط) کے۔ ایل۔ ایم۔ دت
ایم۔ اے۔ لاہور

سارٹیفکیٹ
ماہواری ایام کی بیقاعدگی ... اوورٹو ... استعمال سے ... (دستخط)

ہر قسم کی بواسیر کا کامیاب اور یقینی علاج

پائل کیور

معزز قارئین! آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ آج تک بواسیر کا کوئی کامل علاج دستیاب نہیں ہوا لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری تیار کردہ دوا پائل کیور اس بارے میں بالکل مجرب اور بیشمار مریض اس کے استعمال سے کامل طور پر شفایاب ہوچکے ہیں۔ دو ہفتہ کیلئے ۲۸ گولیاں اور ایک ٹیوب مرہم درکار ہوتی ہے۔ گولیاں خون کو بند کرتی ہیں اور مرہم مسّوں کو ہمیشہ کے لئے تحلیل کردیتی ہے۔
قیمت مکمل سٹ عہ علاوہ محصول ڈاک

مرض دمہ کا کامیاب علاج

اقبال از دمہ کیور

جو دمہ۔ کھانسی۔ کالی کھانسی، فصلی بخار اور اس سے پیدا ہونیوالی تمام شکایات مثلاً ناک و رگلے کی سوزش نیز سانس کے متعلق تمام امراض کے لئے بیحد مفید ثابت ہوچکا ہے۔ اور اس کی تصدیق کے متعلق کئی ایک ڈاکٹروں اور حکیموں کے سارٹیفکیٹ بھی آچکے ہیں۔ اور اس کی پہلی ہی خوراک دینے سے دمہ کا دورہ فوراً رک جاتا ہے۔ نیز اس میں کوئی ایسا جزو نہیں جو مضر صحت ہو۔
قیمت ۳۲ خوراک عا/ علاوہ محصول ڈاک

سارٹیفکیٹ
میں نے اقبال از دمہ کیور کو ایک عزیز پر استعمال کیا۔ میں نے اس کو نہایت موثر پایا۔
(دستخط) خان صاحب مظفر خان ریٹائرڈ پولیس افسر لاہور

سارٹیفکیٹ
میں نے پائل کیور ... استعمال کیا ... مفید پایا ... (دستخط) خان صاحب ...

ملنے کا پتہ

پنجاب میڈیکل ہال مزنگ لاہور

المشتہر قدرت اللہ کاتب برکت علی روڈ ولایت لاہور

اردو رسائل کی دنیا میں انقلاب عظیم

رسالہ "ساربان" لاہور

شمالی ہندوستان کا سب سے مشہور اخبار ٹریبیون لکھتا ہے کہ "رسالہ ساربان کے مضامین پر نظر ڈالنے سے اس کا یہ دعویٰ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تحریکات کو ترقی دینے کے لئے جاری کیا گیا ہے"۔

اسی طرح انگریزی روزنامہ "ایسٹرن ٹائمز" لکھتا ہے کہ لاہور سے کئی ایک ماہوار جرائد اردو زبان میں نکلتے ہیں مگر ساربان نے ایک نئی راہ اختیار کی ہے اس میں متعدد مضامین نہایت عمدگی سے لکھے گئے ہیں۔

اخبار ہمدرد دہلی نگر کی رائے ہے کہ ساربان کا اجرا، ماہانہ جرائد کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے اور اپنی قسم کی پہلی سعی ہے۔

اخبار انجم لکھنؤ لکھتا ہے کہ ساربان اپنے مقاصد کے اعتبار سے یگانہ ہے اور بہت ہی کارآمد ہے۔ اصحاب ذوق کو اس کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔

غرضیکہ رسالہ ساربان کے زبردست اور پرجوش مضامین کی طول و عرض ملک میں دھوم مچ گئی ہے متعدد مشاہیر قوم اور اخبارات نے "ساربان" کا شاندار خیر مقدم کیا ہے جن سب کا تذکرہ بسبب قلت گنجائش یہاں نہیں کر سکتے۔

پس

اگر آپ کو انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل سے دلچسپی ہے یا اگر آپ معلومات میں اضافہ اور اپنے دل اور دماغ کو روشن کرنا چاہتے ہیں تو فوراً رسالہ ساربان کے خریدار بن جائیے۔ ہر قوم اور ہر فرقہ کے بلند علمی مذاق رکھنے والے لوگ اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اردو زبان میں یقیناً یہ بالکل نئی طرز کا اور بیحد کارآمد رسالہ ہے۔

رعایتی چندہ دو روپیہ سالانہ اور چھ ماہ کے لئے صرف ایک روپیہ

نوٹ:۔ رسالہ ساربان کیلئے محنتی کنویسروں کی ضرورت ہے۔ شرائط کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ارسال کریں۔

مینیجر رسالہ "ساربان" لاہور

ہندوستان کے بلند پایہ باتصویر ماہنامہ

رسالہ "شاہکار" لاہور

کے

سالانہ خریداروں کو کیا ملے گا؟

بارہ سہ رنگا اعلےٰ آرٹ کی حسین تصاویر فریم میں لگانے کے لائق۔ ۷۵ یک رنگی خوبصورت تصاویر کا شاندار البم۔ دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں کے پچاس دل فروز تازہ افسانے، ہندوستان کے عالی پایہ سحر طرازوں کی روح خیز تازہ نظمیں، منتخب غزل نگاروں کی ایک سو چیدہ غزلیں، بارہ کتابوں کے برابر دنیا کے عالیجاہ مصنفین، مفکرین، فلاسفہ، سائنسدانوں کے خرد افروز خیالات کا مشہور زبانوں سے ترجمہ، سب سے بڑھ اعلےٰ آرٹ کی سہ رنگی و یک رنگی پچیس تصاویر اور دل بہلانے والی تازہ کہانیوں سے لبریز ڈھائی سو صفحے کا

سالنامہ خریداروں کو مفت ملے گا

آج ہی سالانہ خریداری کی اطلاع دیجیئے

سالانہ چندہ چھ روپے۔ نمونہ کے لئے آٹھ آنہ کے ٹکٹ بھیجیئے۔

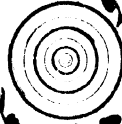
نادار طلباء، کم استطاعت خریداروں اور عورتوں کو ساڑھے چار روپے کا منی آرڈر بھیجنے پر بشرطیکہ ایسے حضرات فروری سنہ ۱۹۲۶ء سے خریدار بن جائیں۔ رسالہ سال بھر مع سالنامہ آتا رہے گا۔

مینیجر رسالہ شاہکار چراغدین روڈ مزنگ لاہور

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!

اعلےٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئل استعمال کرتی ہیں۔

طبقہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے۔



یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

اگر چاہتے ہو کہ جوانی کی کرنیں تمہارے جسم میں دوڑنے لگیں اور سچے معنوں میں جوان کہلاؤ۔ بوڑھے ہو تو بڑھاپا جوانی میں بدلنا شروع ہو جاوے تو

جناب کوی و نوید فن تشہور نوجوانوں پنڈت ٹھاکر دت جی شرما وید موجد امرت دہارا و شوگری کی

تیار کردہ

کرن جوانی

کو استعمال کرو اور دوسرے ہزاروں اشخاص کی مانند آپ بھی فایدہ اٹھاؤ!

چند خطوط کا خلاصہ ضرور پڑھئے!

مکرم بندہ تسلیم! بندہ نے دو شیشی آپکے کارخانہ سے کرن جوانی منگوا کر استعمال کی ہیں ماشاءاللہ بہت فایدہ ہوا واقعی بے نظیر چیز ہے کئی عوارض جسمانی و دماغی کے واسطے تیر بہدف ثابت ہوئی ہے
(محمد دلدار حسین قریشی راولپنڈی)

شرما جی نمستے! آپ کی کرن جوانی سے مریضہ کو بہت فایدہ پہنچا جو کہ ایک پرشش سے نہیں ہوا تھا واقعی اکسیر ثابت ہوئی۔
شو شرن پوری نائب تحصیلدار انبالہ

بجناب تسلیم! کرن جوانی واقعی جوانی کی مشعل نکلی اس کی پہلی ہی خوراک اپنا لاثانی اثر دکھلاتی ہے دماغی کمزوری کے دور کرنے میں بے مثل ہے۔
(جگن ناتھ شرما اوور سیر امرتسر)

جناب بندہ اپنے آپکی دوائی کرن جوانی ایکدست پر آزمائی یہ عام کمزوری اور ضعف کیواسطے ایک بے نظیر دوا ہے۔
نند لعل ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جیلز

شرما جی نمستے! آپ کی ارسال کردہ کرن جوانی کا استعمال کیا گیا ہے کمزوری عام کے لئے مفید ہے

صرف ایک شیشی استعمال کی گئی ہے دوبارہ منگوانے کا ارادہ ہے۔
(ارجنداس سہگل دوکاندار گوگو)

جناب تسلیم! کرن جوانی میں نے منگوائی تھی جو کہ ہمہ صفت موصوف ثابت ہوئی اور جس مریض کیواسطے منگوائی تھی اسے کامل صحت ہو گئی
(کانشی رام اکونٹ کا خزانہ لوبہ ٹیک سنگھ)

جناب بندہ! کرن جوانی کی گولیاں استعمال میں لائی گئیں واقعی مفید ثابت ہوئی جو تعریف انکی فہرست میں درج ہے فایدہ اس سے بدرجہا ہیں۔
(کے چند سیدہ ماسٹر کورٹ رام چند)

جناب بندہ تسلیم! اس نے جو کرن جوانی کی گولیاں آپ سے منگوائی تھیں درحقیقت انہوں نے بہت ہی فایدہ کیا جن تکالیف میں مبتلا تھا۔ بالکل دور ہو گئیں سنکرجو ادویہ استعمال کرنے کے بعد آپ کی کرن جوانی نے معجزہ کا کام کیا۔ انشاءاللہ جس وقت کسی شخص کو ضرورت ہوگی فوراً آپ سے طلب کریں گے۔
شیخ احمد حسین سوداگر بیٹر گنگا جاندہ

کرن جوانی جسمانی ان پر جن کے رسوں سے جوانی قایم رہتی ہے سیدھا اثر کرتی ہے اور ندود کے غدود جا کے کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس کے کھانے سے دل دماغ معدہ جگر گردہ مثانہ طحال آنتیں اور وقت پر اچھا اثر ہونے لگتا ہے دن بدن دماغ روشن ہو جاتا ہے دل میں خوشی و امنگ بڑھتی ہے جگر صاف ہو کر رنگ خوبصورت و سرخ ہو جاتے ہیں نزلہ زکام کھانسی دور ہوتی ہیں بھوک بڑھتی ہے کھایا پیا ہضم ہوتا ہے قبض رفع ہوتی ہے۔ ہر قسم کی کمزوری دور ہو کر قوت بڑھنے لگتی ہے کا نام نہیں رہتا پیشاب کے تمام نقایص دور ہوتے ہیں جوانی کی امنگیں اٹھنے لگتی ہیں!

قیمت ۴۸ گولی ایک روپیہ۔ یکصد گولی چار روپے خوراک ایک یا ۲ گولی صبح ایک یا ۲ گولی شام ہے

خط و کتابت و تار کا پتہ۔ امرت دھارا لاہور

المشتہر مینجر امرت دہارا اوشدھالیہ امرت دہارا بھون امرت دہارا روڈ امرت دہارا ڈاکخانہ لاہور

کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ

ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲ وہی دواخانہ ہے جسے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے ۱۹۰۳ء میں …
ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲ وہی دواخانہ ہے جسے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم … اپنے خاندانی تجربات …
ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲ وہی دواخانہ ہے جس سے کسی کا ذاتی منافع … نہیں …
تقریباً دو لاکھ روپیہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج پر خرچ ہوتی ہے جہاں ہر ملت و مذہب کے طلباء کو ویدک اور یونانی کی تعلیم
دی جاتی ہے۔ اور جس کے شفاخانوں میں غریب مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی دواخانہ کی کوئی برانچ ہندوستان
کے شہر میں نہیں ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶	ہندوستانی دواخانہ کی چار لاجواب دوائیں	تار کا پتہ: [illegible] دہلی

عرق ماء اللحم خاص الخاص

یہ بہترین مقوی جسم (ٹانک) اور زود ہضم غذائے دوائی ہے۔ جسمانی قوتوں کو تیز کرتا اور حرارت غریزی کو برانگیختہ کرتا ہے۔ خون کثرت سے پیدا کرتا اور بدن کو جلد فربہ بنا دیتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا مقوی ہے۔
ترکیب استعمال: ۵ تولہ ماء اللحم خاص الخاص میں مصری ایک تولہ ملا کر پلائیں۔ قیمت فی بوتل ۱۲ خوراک [illegible]

مصفی

خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی دوا ہے۔ کھجلی، داد، چنبل، چھائیں، مہاسے اور ہر قسم کے پھوڑے پھنسیوں کے لیے اکسیر ہے۔ جذام (کوڑھ) اور بواسیر جیسی خبیث بیماریوں کا زہریلا مادہ اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔
ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ارسال ہوگا۔ قیمت فی شیشی [illegible]

شربت صدر

نزلہ و زکام اور اس سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کے لیے اکسیر ہے۔ پرانے بگڑے ہوئے نزلہ و زکام کو درست کرتا، کھانسی کے بار بار کے حملوں کو روکتا ہے۔ بلغم کو نکالتا اور دمہ، کھانسی، تھوک کے ساتھ خون تھوکنا اور سل و دق جیسی خطرناک بیماریوں کو دور کرتا ہے۔
ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ارسال ہوگا۔ قیمت فی شیشی [illegible]

[illegible]

قبض اتفاقی ہو یا دائمی … کی گرانی … بدہضمی، متلی، ضعف جگر، ورم جگر یعنی جگر کا بڑھ جانا اور سوزش ابتدائی … ہیں۔ سوداوی درد سر، جسم کی سستی، خون کی … دور ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ …
ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ارسال ہوگا۔ قیمت [illegible] ۱۲ خوراک [illegible]

ملنے کا پتہ: ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی

ڈونگرے کا بال امرت

یہ

ڈونگرے کا بال امرت

میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی کھانسی، بخار، بدہضمی، پیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور اس سے بچوں کا بدن تھوڑے عرصے میں گوشت سے بھر کر جسم میں طاقت بڑھتی ہے۔

لاہور ایجنٹ

بھگت رام پوری اینڈ سنز، سوتر منڈی۔ لاہور

نغمۂ زندگی

ایک بلند پایہ شاعر اور نقاد کی نظر میں

جناب صاحبزادہ ابو النعیم عبد الحکیم خان صاحب نشتر جالندھری ہندوستان کے ان جلیل القدر و صاحب طرز اساتذہ کی صف اول میں ہیں جن کی مساعی سے اردو شاعری زندہ ہے۔ حال ہی میں نغمۂ زندگی کے نام سے آپ کا مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے جو اسلامی، قومی، تاریخی، نیچرل، اخلاقی، فلسفیانہ اور جذباتی نظموں غزلوں اور رباعیوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں سادگی، فصاحت و بلاغت، چستی بندش، اسلوب ادا کی ندرت، تراکیب کی جدت، کیف، علو، جوش اور اثر غرض تمام محاسن شعری پوری شان سے جلوہ گر ہیں۔

تغزل میں نشتر صاحب ایک خاص رنگ کے مالک ہیں جو ان کے کسی معاصر شاعر میں نظر نہیں آتا۔ ان کا کلام جہاں خودداری، عالی حوصلگی، سخت کوشی، بلا طلبی اور بحر مصائب میں کود کر گوہر کف ساحل پر آنے کی دعوت دیتا ہوا انسان کو زندگی کے بلند ترین مقام پر متمکن ہونے کی راہ بتاتا ہے، وہاں زبان اور فن وغیرہ کے اعتبار سے بے عیب مستند اور ٹکسالی بھی ہے اور یہی وہ دو گونہ جوہر ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کر رہا ہے۔ غرض نغمۂ زندگی بیسویں صدی کی ارتقائی اردو شاعری کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس میں یہ فن لطیف فرق تخیل کے پر لگا کر معراج کمال پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ نشتر صاحب ایک نادرہ کار جادو نگار شاعر ہیں اور ان کا وجد آفرین حیات افروز غیر فانی کلام ابد الآباد تک ان کے نام کو شہرت عام اور بقائے دوام کی تاج پوشی کرتا رہے گا۔

ملک کے مایۂ ناز انشاء پرداز و مستند ادیب شعر حضرت مولانا غلام رسول صاحب مہر ایڈیٹر مالک ومدیر روزنامہ انقلاب لاہور کا ایک فاضلانہ و بصیرت افروز مقدمہ اور مصنف کی تصویر زینت کتاب ہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات، سرورق سبز رنگین و خوشنما، کاغذ چکنا ولایتی، کتابت و طباعت نفیس، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (اعلیٰ مجلد مطلا ڈیڑھ روپیہ)۔ ملنے کا پتہ:

محمد نصیر ہمایوں مالک قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

بچوں کا تاش

یعنی

بچوں کی ابتدائی تعلیم میں آسانیاں

حرف شناسی اور عبارت خوانی کو آسان تر بنانے کیلئے ہم نے ایک تاش ایجاد کیا ہے جو بچوں کیلئے بیحد مفید ثابت ہوا ہے جس سے بچے کھیل ہی کھیل میں پڑھنا سیکھ جاتے ہیں اور نہایت ہی قلیل عرصہ میں کافی لیاقت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہر گھر میں اس کا ہونا بیحد ضروری ہے۔

قیمت اردو ۔ انگریزی ۔ معہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

نیشنل ٹوائے کمپنی ۱۲ اندر روڈ لاہور

مخزن حکمت مصوّر

یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم طبع نہم

مصنفہ جناب خانصاحب ڈاکٹر و حکیم غلام جیلانی شمس الاطبا ۔ حجم مع تصاویر ۲۶۰۰ صفحات

جس میں تقریباً چار صد عکسی رنگین تصاویر دی گئی ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ دُکھ درد بیماریاں ہمیشہ انسان کے ساتھ ہیں جن کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں اور پھر آناً فاناً بعض بیماریاں کچھ ایسی خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہیں کہ اگر طبیب یا ڈاکٹر پاس ہو تو مریض کے تلف ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے ضروری نہیں کہ ڈاکٹر و طبیب ہر وقت پاس ہے ایسی حالت میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ ایک ایسی عمدہ جامع و صحیح و قابلِ اعتماد کتاب ہر ایک گھر میں موجود ہو جس کی مدد سے ہر شخص ہر ایک مرض کا علاج خود کرسکے اس مقصد کے پیش نظر جامع ترین کتاب مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم "معرض وجود میں آئی ہے چنانچہ زمانہ حال کے اکثر نامی گرامی ڈاکٹروں حکیموں، عالموں اور فاضلوں اور دیگر ممتاز مشاہیر ملک کا یہ ایک متفقہ قول ہے کہ "مخزن حکمت ہر ایک دوخواں کے پاس ضرور موجود ہونی چاہیئے" مخزن حکمت میں ہر مرض کی مکمل تشخیص انجام و عوارض حفظ ما تقدم علاج ڈاکٹری، علاج انجکشن زیر جلدی پچکاری، علاج بذریعہ پیٹنٹ ادویہ اور طبی علاج کا مفصّل بیان دیا گیا ہے ۔

قیمت ہر دو مکمل جلد مجلد تیرہ روپے بارہ آنے ۔ بلا جلد بارہ روپے چار آنے ۔

صرف ایک ماہ کیلئے رعایتی قیمت مکمل مجلّد گیارہ روپے بارہ آنے ۔ بلا جلد دس روپے چار آنے ۔

ملنے کا پتہ: طبی کتب خانہ شمس الاطبا اندرون بھاٹی گیٹ لاہور

مخزن حکمت

دو ڈرامے

مشہور روسی افسانہ نگار چیخوف کے دو مطائبات

اُردو لباس میں

مترجمہ

سعادت حسن منٹو مترجم سرگذشت اسیر و ویرا روسی افسانے چیخوف کے یہ تمثیلے اس کا مخصوص مزاحیہ رنگ اور ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک یورپ کی مختلف سٹیجوں پر کھیلے جا رہے ہیں۔ ترجمے میں اصل عبارت کی جملہ خوبیاں برقرار ہیں۔

طباعت و کتابت دیدہ زیب کاغذ و میز سرورق عمدہ قیمت صرف ۱۲ر

ناشر

حسنِ خیال کمپنی (شریف پورہ) امرتسر

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر نقاشِ فطرت

خواجہ عبدالسمیع پال آنز سہائی

ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل ہائیکورٹ سرینگر

کے کیف انگیز روح پرور اور بصیرت افروز کلام کا مجموعہ

خمستان

قیمت دو روپے

ملاحظہ فرمایئے۔ ایک ایک شعر آپ کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر آپ پر کیف سرمدی کی حالت طاری کر دیگا۔ حجم ... صفحے

ملنے کا پتہ

کشمیر پبلشنگ کمپنی سرینگر کشمیر

بالکل مفت

رسالہ راہنما اردو کا اسلامی، اخلاقی، علمی ادبی ماہوار رسالہ صرف پانچ آنہ کی ٹکٹ برائے محصول ڈاک آنے پر رسالہ سال مفت امید ہے ناظرین "ہمایوں" رسالہ مفت جاری کرانے میں دریغ نہ کریں گے۔

پتہ: منیجر رسالہ راہنما پوسٹ ماسٹر جبانہ ضلع جھنگ

بجلی کی منظور شدہ درسگاہ

سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ ہے

جو گورنمنٹ رجسٹرڈ ہے۔ اس میں ہر قابلیت کے طلباء داخل ہوتے ہیں سکول کو پنجاب پاور ہاؤس ہے جس میں آر سی و ڈی سی دونوں قسم کے جنریٹر ہیں سٹی اینڈ گلڈز انسٹیٹیوٹ کے امتحان کیلئے بھی طلباء کو تیار کیا جاتا ہے۔ جناب وزیر تعلیم و چیف الیکٹریکل انجینیر پنجاب اس سکول کی تعلیم ضبط اور نظم و نسق پر اطمینان فرما چکے ہیں۔ انسپکٹر آف انڈسٹریز پنجاب نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایسی اچھی تعلیم کی توقع صرف انگلستان کے سکول ہی سے کی جا سکتی ہے

پراسپکٹس مفت بھیجے جاتے ہیں۔

(منیجر)

مقدر کی آزمائش
(سات روپیہ دو آنہ میں)
یہ وہی زریں موقع
ہے
دولت کی کان گرانڈ نیشنل
جس کی
دنیا عرصہ سے منتظر تھی
تیس لاکھ پونڈ
تقریباً تین کروڑ روپیہ کے نقد انعامات
آئرش ہوسپٹلس سویپ سٹیکس سے دنیا کا ہر شخص اور بچہ بچہ واقف ہے۔ اس کی
تعریف بیکار ہے۔ ناواقف شخص کسی سے معلوم کر لیں۔ ایسے سب سے
بڑے سویپ سٹیکس کی گرانڈ نیشنل کی تاریخ ۲۷ مارچ ۱۹۳۶ء ہے
ٹکٹ اس پتے سے منگانے چاہئیں
ایسٹرن بلینی فینشیل ڈپو باغ اسٹریٹ علیگڑھ

گراموفون کے
پرانے ریکارڈ
اگر آپ کے پاس ہوں تو انہیں مت پھینکئے
سائنسدانوں نے ایک مصالحہ حال میں دریافت کیا ہے
جسکو
زیڈ
ZED
کہتے ہیں اس کے لگانے سے بگاڑوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری
ہو جاتی ہیں اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے۔ وہی دلکش نغمے جو بہت
پھیکے لگتے ہیں از سر نو عود کر آتے ہیں۔ گھر گراہٹ بالکل مٹ جاتی
ہے۔ نئے ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ
جلد گھستے نہیں۔ خوب بک رہا ہے۔ آپ بھی خرید لیجئے
قیمت ایک شیشی دو روپیہ چار آنہ محصولڈاک گیارہ آنہ
گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی سپرڈری
سی پی

ہمالیہ کے کنارے

پیدا ہونے والی ہر یاؤں میں اگنے والی

دو سرتی جگہوں سے ملنے والی عمدہ عمدہ جڑی بوٹیوں کو نت و مشقت سے
اکٹھا کر کے زندگی افزا ادویات تیار کرنے والے مشہور عالم کارخانہ کی

آتنک نگرہ گولیاں

تمام دنیا جانتی ہے کہ خون وغیرہ کی جملہ خرابیوں کو دور کر کے حیرت میں
ڈال دینے والی دوا ہے قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں ایک روپیہ

بال ہتر گولیاں

بچوں کی جملہ بیماریوں اور کمزوریوں کو دور کر کے طاقت دیتی ہے
اور ماں سے بھی زیادہ پرورش کرتی ہے

آیورشی اور اوگیہ عمدہ خوشبو دار تیل

یہ خوشبودار تیل بالوں کو ملائم کرتا ... دماغ کو قوت دیتا
ہے جسم کو مضبوط بناتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کو ضرور ایک شیشی
اپنے پاس رکھنی چاہیے قیمت ۵ تولہ ایک روپیہ (عہ)

کرانتی تیل

[illegible]
[illegible] قیمت فی [illegible] تولہ (عہ)

جیسنگی گولیاں

چند گھنٹوں میں جان لے جانے والے ہیضہ جیسے موذی مرض کو دور کر کے
مکمل شفا بخشتی ہے قیمت تیس گولیاں ایک روپیہ (عہ)

درن مردن مرہم

ہر قسم کے زخم، خارش، گہرے سے گہرا زخم، زہر باد وغیرہ کو چند
روز میں دور کرتا ہے قیمت فی ڈبیہ ۲ تولہ (عہ)

نیتر انند مدار سرمہ

آنکھ کا پھولا، سرخی، جالا، پانی کا لگنا، تمام شکایات دور ہو جاتی ہیں قیمت
فی تولہ ایک روپیہ محصول ڈاک سب داں لوگ کا علاوہ

آتنک نگرہ فارمیسی جام نگر کاٹھیاواڑ

سے طلب فرمایئے

برقعہ نوایجاد

۱۹۰۵ء سنہ میں اوّل نقاب ایجاد کی ہے

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی نمائش ۲ طلائی و
نقرئی تمغے حاصل کر چکے ہے

خوبصورت آرام دہ زمانہ حال کے مطابق مکمل پردہ دار ہے

برقعہ نوایجاد دو حصوں میں منقسم ہے

تشریح بالائی حصہ

[illegible] بہترین طریق پر ہاتھوں کی بنائی
[illegible] کردہ
کمان دار ٹوپی لگی ہوئی ہے یہ نقاب کو چہرے پر لگنے نہیں دیتی کہ
چہرے پر نقاب لگنے سے دم گھٹنے اور نظر کی چیز صاف دکھائی
دے۔ ٹوپی کا بالائی حصہ خوشنما بیلوں کی شکل میں ہے

تشریح زیریں حصہ

[illegible] عمدہ کوٹ کے [illegible]
[illegible] ہوئے ہیں [illegible]
[illegible] کے لیے پہلوؤں میں لگے ہیں بند گاڑی [illegible] وغیرہ میں اگر
پردہ کی ضرورت نہ ہو [illegible]
لباس کو گرد و غبار سے بچاتا ہے اور ضرورت کے وقت بالائی
حصہ پہن لیں تو برقعہ بن جاتا ہے۔

ہر دو حصہ سے مکمل پردہ دار برقعہ بن جاتا ہے

بشرطیکہ آپ منگائیں آج ہی کندھے سے پیر کے ٹخنے تک
کا ناپ روانہ کریں آپ کی خواتین کو اس کی ضرورت ہے
خود ملاحظہ کریں اور دیگر پردہ دار خواتین کو پسند کرنے کا موقع دیں

قیمت

سفید	رنگین سوتی	رنگین پاپلین سلک	رنگین لٹھا
۱/۱۲/۱ - ۱۲/-/-	۱۰/-/-	۱۵/-/- ، ۱۶/-/-	۱۵/-/-

رنگین سلک ۱۶/-/-

ملنے کا پتہ: خاتون سٹور دہلی پوسٹ بکس ۴۳



خوبصورت بننے کے لئے الزبتھ آرڈن کی تیار کردہ اشیاء استعمال کریں

یہ اشیاء سائنٹیفک طریقہ سے تیار کی گئی ہیں۔ ان کے استعمال سے انسانی جسم کی قدرتی نشوونما کو ہر طرح سے مدد ملتی ہے۔ یہ جلد کو تندرست اور خوبصورت بناتی ہیں۔ الزبتھ آرڈن کا خوبصورت بننے کا طریقہ تین اصولوں پر منحصر ہے

اول:۔ جلد کو وینیشین کلینزنگ کریم سے صاف کرنا۔

دوم:۔ جلد کو قدرتی خوبصورتی دینے کیلئے آرڈینا سکن ٹانک اور سپیشل اسٹرینجنٹ کا استعمال کرنا۔

سوم:۔ جلد کو تروتازہ رکھنے کیلئے اورنج سکن فوڈ یا آرڈینا ویلوا کریم کا استعمال کرنا۔

مذکورہ بالا تینوں اصول جلد وجسم کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ اس لئے آپ اپنے جسم کی حفاظت کیلئے روزانہ انہیں استعمال میں لائیں۔

ملنے کا پتہ

جگت سنگھ سن اینڈ برادرز کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ مال روڈ لاہور

سید عبداللطیف پرنٹر وپبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا